عشاق کا قافلہ

Vol-30

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحق سنگت اکیڈمی محفوظ ہیں

ضابطہ:

کتاب	:	عشاق کا قافلہ: جلد30
مصنف	:	ڈاکٹر شاہ محمد مری
اشاعت	:	2016ء
قیمت	:	-/250روپے
ناشر	:	سنگت اکیڈمی آف سائنسز

اسٹاکسٹ:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ

فون:081-2843358

ای میل:editor@sangatacademy.net

انتساب

اُس نفرت کے نامؔ

جو مزدور کو سرمایہ داری نظام سے ہوتی ہے!

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم

اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

فہرست

پیش لفظ 07

ڈاکٹر امیر الدین 09
ڈاکٹر فہمیدہ حسین 25
محمد سرور 27
انور احسن صدیقی 34
سائمن غلام قادر 37
اکرام احمد 43
سعید مستوئی 46
عزیز مینگل 50
انوار احمد 58
اکبر بارکزی 78
جاوید اختر 79
کسنڈرا بالچن 94

خلیل صدیقی 98
دربدر خاک بسر 106
واحد بشیر 110
افضل توصیف 112
گوہر ملک 119
محمد علی صدیقی 122

پیش لفظ

''عشاق کے قافلے'' نامی سلسلے کی یہ تیسویں جلد ہے۔ اور اب تک کی آخری جلد۔ مگر قافلوں نے تو تھمنا نہیں۔ لہٰذا بہت سی جلدیں بنتی جائیں گی۔ قافلوں میں شامل لوگ، اُن کے راہبر اور اُن کے رپورٹیئر بدلتے رہیں گے۔ اکتیسویں جلد کون لکھے گا؟، اور اس میں کن کن معلوم اور نامعلوم افراد کا تذکرہ ہوگا، کوئی کیا جانے؟!

اس جلد میں شامل لوگ سب کے سب میرے ہم عصر ہیں۔ کوئی چند سال بڑا ہے، کوئی دو چار برس چھوٹا۔ اس لیے یہ صرف میرے میٹھے ہم عصر ہی نہیں بلکہ میرے جگری دوست بھی ہیں۔ ہم نے کسی نہ کسی شکل میں اکٹھے کام کیا ہے۔ اوسطاً نصف صدی کی رفاقت میں ہم سب ایک دوسرے کے لیے آئینہ بھی رہے ہیں اور ونڈ سکرین بھی۔ چوں کہ کام اور مشن کی طرح زمان و مکان بھی تقریباً ایک ہی رہا ہے، اس لیے میرے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ رہا ہے کہ زندگی میں بے تکلفی کو یہاں کتاب میں ڈالنے سے کہیں کسی یارِ مہرباں کی بے تکریمی نہ ہو۔ دوسرا چیلنج خود کو دہراتے رہنے سے بچانے کا رہا۔ بس یہ دو شعوری کوششیں رہیں۔ بقیہ تو سارا فی البدیہہ رہا کہ سب کچھ سامنے ہی کا تو قصہ ہے۔

مگر یہ قصہ کس قدر خوف ناک رہا۔ آنتیں نکالنے والے جھولوں جھٹکوں اور سر چکرا دینے والے موڑوں سے بھرا قصہ۔ ایشیا ہماری اس نصف صدی میں قہر و مہر کی تلخیوں شیرینیوں کے بیچ پنڈولم بنا چل رہا ہے۔ جانا پہچانا غدار انقلابی بنا، اور مستند انقلابی کو تیز ہواؤں نے اٹھا کے میدان

کے دائیں کھدرے میں پٹخ دیا۔ دلیل، منطق، اعزاز الزام سب کھڈے میں۔ دو انتہاؤں کے بیچ چلتے پنڈولم نے ساری آبادی کو دو چہروں والا بنا ڈالا۔ کون کس کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے مگر اصل میں ہے کس کے ساتھ، پتہ ہی نہیں چلتا۔ شک شبہ، خفیہ گیری، دروغ گوئی اور............خوف!!

اِن میں سے ہر ایک کا شکریہ کہ لیفٹ رائٹ کے تھپیڑوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رہے اور ایک دوسرے کو ضمیر کی شرمندگی سے بچائے رکھا۔ بلیک میں بکنے والے غداری، وفاداری کے سرٹیفکیٹوں کا مل کر سامنا کیا۔ شخصی زور آوریوں، کم زوریوں کو اجتماع اور تنظیم کے ذریعے قابو کیا اور ایک دوسرے کی تکمیل میں مدد کی۔ انسان ذات کے ساتھ دوستی واحد قدرِ مشترک رہی......۔

ایسے کتنے ہی بابرکت ہم عصر انسانوں پہ لکھنا میرے دل اور قلم کی خواہش رہے گی!!

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری 2016

’جور، ترنپ ترنپی آ!‘ (زہر، قطرہ قطرہ)

ڈاکٹر امیر الدین

(16 اکتوبر 1936 ..... 14 جولائی 2002)

میں نے جب ’’عشاق کے قافلے‘‘ کے عنوان کے تحت نسلِ آدم کی فلاح کے کاروانِ جہد میں شامل، اپنے اکابرین اور دوستوں کی سوانح لکھنی شروع کی تھی تو ذہن میں امیر الدین کا نام سب سے آخر میں رکھا تھا۔ اس خیال سے کہ پہلے عمر رسیدہ احباب کا تذکرہ ان کی زندگیوں میں کیا جائے، امیر الدین تو بہت بعد میں، شاید میرے بھی بعد مرے گا۔

احمق ہیں وہ لوگ جو موت کی گھڑی کے لیے جمع تفریق کرتے رہتے ہیں۔ موت کے لیے کیا وقت، کیا گھڑی؟۔ ابھی تو انسان اسے ذرا سا پیچھے دھکیلنے کے قابل ہوسکا ہے۔ ابھی تو انسان ہزاروں اسباب رکھنے والے اس مظہر کو برپا نہ ہونے دینے کے لیے انھی اسباب کو کُند کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ابھی تو اموات کی اکثریت ایسی ہے جن کی وجہ کے خانے میں ڈاکٹر لوگ (Cause of Death) وجہِ موت کی بجائے Probable Cause of Death لکھتے ہیں۔ امیر الدین کی موت کا Probable Cause حادثہ تھا......مگر خود حادثات‘ کہاں بے سبب ہوتے ہیں؟۔

امیر الدین ہمیشہ نمبرون رہتا تھا۔ اگلی نشستوں کا آدمی۔ دی پرنسپل، دی سیکرٹری جنرل، دی پریذیڈنٹ، دی چیئر پرسن۔ اس نے ہر بلند عہدے کا ذائقہ چکھ رکھا تھا۔ بس ایک عہدہ ایک

لقب رہ گیا تھا، جسے اُس نے اپنے دوستوں سے پہلے حاصل کرنا تھا......سوٗ امیر الدین ہم سب دوستوں میں سے سب سے پہلے وہ لقب، وہ خطاب بھی وصول کر گیا، چلو اب وہ ’مرحوم‘ بھی بن بیٹھا۔ مگر مضحکہ خیز بات دیکھیے کہ امیر الدین سابقہ پرنسپل، سابقہ سیکرٹری جنرل اور سابقہ صدر تو ہوسکتا ہے مگر کوئی بھی اُسے، کبھی بھی ’سابقہ مرحوم‘ نہیں لکھ پائے گا۔ وہ اس خطاب میں نہ تو کسی وڈیرہ اور ٹکری کی حمایت لینے پر مجبور تھا اور نہ ہی ووٹروں، اور حامیوں کے رحم و کرم کا محتاج۔ بغیر کسی کمپین کے، بغیر کسی کنوسنگ اور لابنگ کے اس نے یہ عہدہ حاصل کرلیا......اپنے ہی زورِ بازو سے......اور یہ اس کا وہ واحد عہدہ تھا، جس کے حصول پہ ہمیں کوئی خوشی نہ ہوئی اور جس پر ہم نے اسے سخت برا بھلا کہا۔

زندگی، رواں دواں زندگانی کا، سب سے بڑا مگر دلچسپ ترین معمہ ہے۔ مارکوئیز کے بقول ’’زندگی، ساری ایجادات سے بہتر ایجاد ہے‘‘۔ موت اُس کی لازمی، منطقی، متصادم و بنیادی تضادی، صورت ہے۔ اس اٹل حقیقت کو ہم نسل در نسل مانتے چلے آئے ہیں۔ مگر زندگی جب خود اپنے ہی قدر دانوں کو مارتی ہے تو بہت صدمہ ہوتا ہے۔ اور، امیر الدین تو زندگی کے گیت گاتا تھا، زندگی کا ہار سنگھار کرتا تھا، اُسے جینے کے قابل بنانے میں لگا رہتا تھا، اُسے انسانوں کی بڑی اکثریت کے لیے مقبول و محبوب بنانے کی جدوجہد کرتا تھا۔

ہم سید امیر الدین کی رفاقت سے اس عہد میں محروم ہوگئے جس میں لوگ دوستوں کے نہیں‘ مقام و دولت کے بھوکے ہیں۔ ہمارے اس آدمیت پرست ساتھی کے ہاتھ اس وقت کاٹ دیے گئے جب ان مصمم ہاتھوں میں تھامے بلند پرچم کو جھپٹ کر تھامنے اور اُسے جاوداں سر بلند رکھنے کے لیے وافر ہاتھ موجود نہیں ہیں۔ اس انسان دوست شخص کا تعلق قحط الرجال والے بلوچستان سے تھا۔ ہمارا بلوچستان بہت پیاسا ہے...... پیاسا‘ بیک وقت بڑے انسانوں کے لیے بھی‘ اور اُن کے خون کے لیے بھی۔ مگر انوکھی بات اب کے یہ ہوئی کہ بلوچستان نے اپنے اس بڑے آدمی کو تلوار سے نہیں، ’حادثے‘ سے مار ڈالا۔

امیر الدین مر گیا۔ زندہ رہ جانے والوں کے لیے بڑا فریضہ مزید بڑا ہو گیا۔ ہمارے

وطن میں سب سے بڑا کام اب سماجی تبدیلی لانا نہیں' تبدیلی لانے والے ہاتھوں کو قائم رکھنا' ہوگیا ہے۔اور امیر الدین زندگی بھر اپنے' ہاتھوں' کی پرورش کرتا رہا، تربیت کرتا رہا، ناز اُٹھاتا رہا، بلائیں لیتا رہا۔ آپ ایسے عظیم ہاتھوں کو کوئی نام نہیں دے سکتے؛ آپ انہیں صرف امیر الدین، عبداللہ جان، خدا دئیداد، کمال خان، سی آر اور انجم قزلباش ہی کہہ سکتے ہیں۔اور پھر یہ نام کہاں مستقل ہیں۔ آج ان ہاتھوں کو یہ نام دے رہے ہیں، کل ہی انہیں سعید مستوئی، نادر قمبرانڑیں' سائمن کانٹ اور ہیوگو شاویز پکارا جائے گا۔ بے ثبات ہیں نام، ابدی ہیں ہاتھ۔ ہاتھ تبدیلی کے، تغیر کے، ارتقا کے، انقلاب کے۔ یہ ہاتھ چھوٹے خانوں میں، ناموں میں فٹ ہی نہیں ہوسکتے، چھوٹی املائیں ان سے لکھوائی ہی نہیں جاسکتیں۔

اور حیدر آباد دکن کی پیدائش والا سید امیر الدین بھی ہمیشہ ہی بڑے کام کرتا تھا۔ بڑے بنگلوں کے حصول کا نہیں، بڑی گاڑیوں کی ملکیت کا نہیں بلکہ اُس کا نہ تو کوئٹہ میں ذاتی مکان تھا نہ کراچی میں...... بے جائیداد مرنے والا پی ایچ ڈی، 25 سال تک پرنسپل رہنے والا بے مکان...... لا مکاں، بے کراں۔

ڈاکٹر امیر الدین عالم گیر سچائی کے قیام کا بڑا کام کرتا تھا، مسیحی اقلیت کو بم مارنے والوں کے خلاف ڈٹ جانا، اغوا کاروں کو اغوا گر قرار دینا، جیل میں پڑے بے گناہ کو چُھڑوانا، انسانی شرف وحقوق کی بحالی، پروگریسو رائٹرز فورم کی مضبوطی، عوامی انقلابی پارٹی کی تنظیم کرنا، جمہوریت کے احیا کا کام، انسان دوستی کے نظریہ کے فروغ کا کام......اس کی پوری زندگی انھی عظیم آدرشوں کی تکمیل میں مصروف گزری، اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے بیلیوں کے ہم راہ۔ مگر جب اس مسلسل عمل میں کسی جھٹکے، کسی چھلانگ کی ضرورت پڑتی تو وہ دوسروں سے چوری چھپے اور سب سے پہلے تن تنہا میدان میں کود پڑتا۔

امیر الدین کوئی بہت گہرا دانش ور نہ تھا۔ اُس کی تحریریں اور تقریریں ادبی حسن و جمال میں یکتا اور ممتاز نہ تھیں۔لیکن وہ انسانی معاملات کی الجھی رسی کا سرا ہمیشہ تلاش کیے رہتا تھا۔ وہ عام آدمی کی شعوری سطح کی بات کرتا تھا اور اُسی کی ذہنی استطاعت کو ساتھ لے کر معاملات ومسائل کی

توضیح وتشریح کرتا تھا۔ مگر، اُس نے بات کبھی نہ ادھوری چھوڑی اور نہ اُسے دھندلا یا گرد آلود رہنے دیا۔ اس نے ہمیشہ زندگی کے مسائل کا حل بھی پیش کیا۔ وہ صاف ستھرے انداز میں اپنا مؤقف پیش کرتا تھا۔

امیر الدین کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر اسٹیج اور موقع کو استعمال کرتا تھا۔ بزنجو کی فکر سے سختی کے ساتھ وابستگی کے باوجود وہ بیک وقت پیپلز پارٹی، جمہوری وطن پارٹی، ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان، پاکستان سوشلسٹ پارٹی، ترقی پسند ادبی تحریک اور ٹریڈ یونین تحریک میں بھی شامل وموجود تھا۔...........اور اِن سب کو قبول بھی تھا۔

امیر الدین نفرت کے باوجود بیوروکریٹوں، سرمایہ داروں کے بیچ رہتا تھا۔ وہ اسے دھتکارتے نہ تھے مگر وہاں وہ Spoiled Child یعنی'' بگڑا بچہ'' ہی کے بطور گردانا جاتا تھا۔ آذر کے اڈے میں رہتا تھا اور وہاں بلند آواز میں اُس کی ٹانگیں توڑنے کے ارادے کی بات کرتا تھا۔ امیر الدین مر گیا، درجن بھر سال گزر گئے۔ آذر شکنی کے ارادوں سے منور اس کے دیگر کئی ساتھی مر گئے مگر آذر کی ٹانگیں ابھی تک سلامت اور جواں ہیں۔ آذر، ایک ایسا مہیب جانور، جس کی سکرات بھی کئی زندگیوں پہ محیط ہے!

امیر الدین عمومی طور پر اچھا سامع تھا۔ وہ آپ کی بات سنتا تھا، آپ سے مشورہ کرتا تھا، آپ سے قائل ہوتا تھا، آپ کے مشورے پر چلتا تھا۔ مگر امتحان کی مخصوص گھڑی پہ آپ کے سارے مشورے، آپ کی رہبری، آپ کی راہنمائی دھری کی دھری رہ جاتی۔ اور وہ اپنے ہی انداز میں مورچے میں موجود ہوتا۔ اس شخص نے زندگی بھر کوئی بے ڈھنگا کام نہ چنا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی ڈھب کا، ڈھنگ کا کام چنتا تھا مگر اسے کرتا بڑے بے ڈھنگے انداز میں تھا۔ مروج کو کبھی مانا نہیں، روایت پہ کبھی چلا نہیں۔ اب دیکھیے نا، موت کتنے ڈھنگ کا مظہر ہے: منطقی، مدلل اور حتمی مظہر۔ مگر اس نے اسے بھی انتخاب کا حق نہ دیا، نہ زماں کا حق نہ مکاں کا حق۔ موت بکی بکی، ہم بکے بکّے ......یہی تھا، امیر الدین کا سٹائل۔

اپنے نظریات سے اس کی وابستگی کی نوعیت بھی بہت دلچسپ تھی۔ مجبوریاں خواہ' معروضی'

ہوتیں یا 'موضوعی' امیر الدین بڑی بے پرواہی سے اپنی بات کہہ ڈالتا۔ اُسے نظریاتی اور سیاسی روایتی بحث کے دوران اونگھ آجاتی تھی۔ وہ تفصیلات میں کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ مگر اپنے نظریات کے اصل مغز، اصل جوہر سے اس کی وابستگی حتمی تھی۔ کمیونزم کے ساتھ اس کا رشتہ NSF والوں کا سا رہا، جہاں نظریہ سازی کے بجائے Activism زیادہ ہوتا ہے۔ کراچی یونیورسٹی تھی (نفسیات میں، پی ایچ ڈی تو بعد میں امریکہ سے ہوئی)، ایوبی آمریت تھی، ہلہ گلہ، پکڑ دھکڑ، جلسہ جلوس، ٹائر سوزی، جمہوریت بحالی نعرے اور دمادم مست قلندر...... یہ تھا پس منظر سید امیر الدین کے سیاسی ابھار کا۔ چنانچہ وہ صرف سرداری، جاگیرداری نظاموں کے لیے ہی مسئلہ نہ تھا، وہ اپنے ہم فکروں کے لیے بھی ایک پرابلم تھا۔ جس وقت ہم روایت پرستی پر گامزن ہوتے تو وہ اچانک 'سبت' کے مقدس دن پرائی فصل توڑ کر کھانے لگ جاتا، ''نامناسب ترین' حالات میں کسی ''نامناسب ترین' جلسے میں اپنے پکے کمیونسٹ ہونے کا اعلان فرمادیتا۔ ہمارے اسٹڈی سرکل سے بے زاری اور نیند سے بوجھل آنکھوں سے اُٹھا تو نواب اکبر بگٹی کی زیر صدارت سیمینار میں خود اسٹڈی سرکل شروع کرڈالا۔ یہاں اپنے رسالے کے اداریے کی بحث میں بے زاری سے بیٹھا ہے تو وہاں ''المرتضیٰ'' لاڑکانہ میں جا کر اداریہ جیسی تقریر کرڈالی۔ ہم دیکھتے رہ جاتے اور وہ فارملٹی کے ''لات'' کو لات اور ''منات'' کو دولتیاں مارتا نکل جاتا۔

امیر الدین ایک معروف ایجوکیشنسٹ تھا۔ بلوچستان میں سوئی کے گرامر سکول اور لورالائی ریذیڈنشل کالج کے بعد وہ ہیلپر سکول کوئٹہ میں بطور پرنسپل کئی سال تک پڑھاتا رہا۔ واضح رہے کہ ہیلپر سکول کا بچہ اپنی مخصوص تربیت کے حوالے سے بہت دور سے پہچانا جاتا تھا۔ میڈیکل کالج میں طلبا سے بات کرتے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ امیر الدین کے زمانے کے ہیلپر سکول سے ہے یا مستنگ کے کیڈٹ کالج سے۔ ہیلپر سکول کا بچہ بہت ہی پراعتماد، سرگرم اور گھل مل جانے والا ہوتا تھا۔ بہت وسیع النظر، روشن خیال اور بشر دوست۔ یہی تھی امیر الدین کی تربیت۔

ہیلپر سکول کی لائبریری قابلِ دید تھی۔ سکول کی سالانہ تقریبات لائقِ ستائش تھیں۔ اس کے علاوہ اس سکول میں زبردست ادبی تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ مشاعرے، پروگریسو رائٹرز

ایسوسی ایشن کی ادبی تنقیدی نشستیں، مباحثے،...... یہاں پروفیسر خلیل صدیقی آتا تھا، عطا شاد آتا تھا، مجتبیٰ حسین، عبداللہ جان آتے تھے، خدائیداد ہوتا......

پرویز مشرف کے مارشل لا کی بھرپور جوانی کے زمانے میں ہیلپرز ایسوسی ایشن کے رجعتی کمانڈروں نے امیر الدین کو اس سکول سے نکال کر ایک محفل اُجاڑ دی۔ وہ ہیلپر سکول جو نصابی اور غیر نصابی محفلوں کا مرکز ہوتا تھا، اُسے کرگس لے اُڑے۔ ظلمتوں کے امین لوگوں کی راجدھانی میں علم کا متقاضی، معصوم امیر الدین جتنی اصلاح کرسکتا تھا، کرگیا...... آگے کسی کو تو ٹوٹنا تھا، Content نے یا شیل نے۔ یہاں شیل مضبوط نکلا، نیوکلیس کو ہی نکال باہر پھینک دیا۔ راجہ احمد خان بلوچستان میں جس طرح کی تعلیم چاہتا تھا، ویسی ہی کی راہیں کھل گئیں..........

امیر الدین بہت بہادر شخص تھا۔ اس کے ہم عصر دانش وروں اور سیاست دانوں کے اندر جرأت اور بے باکی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ہیلپرز سے نکالے جانے کے بعد معاشی مشکلات کو جس خندہ پیشانی سے امیر الدین نے قبول کیا تھا، شاید ہی کوئی اور کرسکتا ہو۔ اس نے مہنگی محفلیں سجانی ترک کردیں، سفر مسافری چھوڑ دی، اخبارات کی تعداد کم کردی، سموکنگ ختم کرنے کے بہانے گولڈ لیف پینے چھوڑ دیے...... کسی کو بتائے بغیر، کسی سے شکوہ کیے بغیر۔ نیم سرکاری تجارتی تنظیموں سے بڑا ظالم کوئی ادارہ ہو ہی نہیں سکتا۔

امیر الدین کی بہادری اور جرأت کے بھرپور جوہر ہم نے ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان، HRCP میں دیکھے۔ ایسی ایسی فورسز سے ٹکر لی اُس نے، جس کا تصور تک ممکن نہ تھا۔ اس سلسلے میں وہ بلوچستان کے ایک ایک کونے میں گیا۔ تربت، گوادر، پنجگور، لسبیلہ، ژوب، پشین، نوشکی، ماوند، سبی...... بہت سی نئی شاخیں کھولیں، بہت سے نئے ممبر بنائے۔ کتنے سیمینارز کیے۔ کتنی ورکشاپیں کرائیں۔ بہادری اور استقامت کے ساتھ مارشل لاؤں کی مخالفت کی، اس حد تک کہ جمہوریت کے نام نہاد ''بیج بردار'' تک اسے '''درست، مگر جذباتی'' کہہ ڈالتے۔ وہ نواب زادوں کی الف رسوا ڈیموکریسی، اور نم زدہ کیڑوں کی جمہوریت نوازی کی اصلیت بھی جانتا تھا' اُسے نعم البدل بھی نظر نہ آتا تھا مگر پھر بھی وہ مارشل لا مخالفت کو اپنی آدرش کا حصہ جان کر اس کی

مخالفت پر تلا رہتا۔

امیر الدین کو اشعار بہت یاد تھے، غالب و میر تو خیر تھے ہی' وہ بالخصوص فیض و جالب و فراز کا حافظ تھا۔ چاہیں تو ایک شعر سن لیں، چاہیں تو صفحوں کے صفحے۔ موقع کی مناسبت سے اس کی یادداشت کا کمر بند ہمیشہ اشعار کے کارتوسوں سے بھرا رہتا۔

امیر الدین زندہ دل شخص تھا، محفل پسند تھا۔ پکنک پرست تھا۔ ہاؤ ہو، محفل، مشاعرہ، موسیقی، فلم اور عشق اس کے محبوب شعبے تھے۔ مشاعروں میں وہ دو چار ہم رنگ دوست منتخب کر کے ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور بجائے روایتی '' واہ واہ'' کہنے کے بہت ہی تخلیقی فقرے چست کرتا، تبصرے اچھال دیتا اور ایک زبردست گرم جوشی کی فضا پیدا کرتا۔ پاکستان میں اگر کوئی ہوٹنگ کلب ہوتا تو امیر الدین اس کا 'تاحیات' چیئر پرسن ہوتا اور اگر فوجی حکومت تاحیات والے ڈرامے کے خلاف آرڈیننس جاری بھی کرتی تب بھی وہ دبئی، انگلینڈ یا سعودی عرب میں رہ کر غائبانہ پانچ سالہ صدر منتخب ہوتا رہتا۔ ڈاکٹر صاحب زبردست حسِ مزاح رکھتا تھا۔ برجستہ فقرے جیسے جیب میں لیے پھرتا ہو۔ وہ بہت ہی اچھی اور بہت ہی 'نا' معصوم گالیاں ایجاد کرتا رہتا تھا۔ وہ شعروں کی زبردست پیروڈی تخلیق کرتا تھا۔

امیر چوں کہ عمر بھر بچوں کو پڑھاتا رہا، اس لیے اسے بچوں کی نفسیاتی اور ذہنی تربیت کا بہت خیال تھا۔ وہ ہمہ وقت بلوچستان کے بچوں کو انسان دوست سوچ عطا کرنے، سائنسی ادراک دینے، اور آزادانہ تفکر کے قابل بنانے میں لگا رہتا۔

وہ دوسرے بچوں کی طرح خود اپنے اندر موجود بچے کا بھی بہت خیال رکھتا تھا۔ اس برگزیدہ نے ہم عام انسانوں کے برعکس اپنے اندر موجود بچے کا گلا نہیں گھونٹا تھا بلکہ اس کے اندر کا یہ بچہ جب چاہتا مچل کر معاملات کا اسٹیرنگ اپنے ہاتھ میں سنبھال لیتا، تب قریبی احباب ہر طرح کی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ مگر وہ بچہ بہت جلد اچھا بچہ بن جاتا۔ انٹی بایوٹکس اور انلجزک اس پر فوری اثر کرتا تھا۔ شرط یہ کہ دوا بھروسے والا ڈاکٹر دیتا۔

ڈاکٹر کی بات آئی تو یہ بھی جان لیں کہ وہ بیماری میں بہت ہی بزدل شخص تھا۔ ذرا سی

تکلیف پر آہ و بقا، فریاد و فغاں...... آسمان سر پہ اُٹھا لیتا۔ مسوڑھے کے انفیکشن میں کراچی داخل ہوا تو شک کینسر کا گزرا۔ جناب نے پوری مملکتِ ''خدائیداد'' میں موجود اپنے تمام دوستوں کو بقلم خود ٹیلی فون فرما فرما کر اس مبارک بیماری کی اطلاع کر دی، اور اس بے وفا دنیا میں صرف دو دن رہ جانے والی اپنی زندگی کے لیے ماتم شروع کر دیا۔ جب اِس غلط اطلاع پر سرزنش ہوئی تو ذرا سی شرمندگی میں کہنے لگا''ہاں! یار مجھ سے...... تیا پا ہو گیا''۔ اسی طرح بلڈ پریشر کم ہونے یا تیزی سے اُٹھ کھڑے ہونے پہ کبھی کبھار چکر سا آ جاتا۔ پھر کیا تھا...... ہائے، دُہائی، ٹیلی فون، بیوی بچوں کو ایمرجنسی کے نفاذ کا کہتا۔

''ڈاکٹر کو بلاؤ۔ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟'' مگر مجھ بے چارے کے پہنچتے پہنچتے وہ فون پر اٹھارہ ڈاکٹروں سے نسخے وصول کر چکا ہوتا۔ دس پندرہ منٹ میں جب میں پہنچتا تو موصوف بڑے سکون و آرام سے بستر پر موجود ہوتا اور دو تین منٹ کے حال احوال کے بعد عملاً مارکسزم پہ تقریر بھی شروع کرتا۔ تین چار زکاموں اور ایک آدھ بخار میں بھی' ہنگامی طور پر بلائے جانے پہ ایک بار ہنستے ہوئے میں نے کہا تھا: 'امیر الدین' کسی روز واقعی شیر آئے گا......''۔ اور واقعتاً ایک روز (14 جولائی 2002 بروز اتوار) وہ منحوس شیر آ ہی گیا اور شال کی وادی کے اس خوب صورت بیٹے کو بڑی بے دردی سے متحرک زندگی سے پرسکون مادے میں ڈھال گیا۔ کاش، طب کی ترقی اس شیر کے پنجے گنجے کر دے۔

انتقال سے بارہ گھنٹے قبل تک ہم اکٹھے تھے۔ شہر کوئٹہ کی پر افتخار بیٹی اور ترقی پسند ادیبہ و دانش ور محترمہ افضل توصیف' ثاقبہ رحیم الدین کے سرکاری قلم قبیلہ کی ادبی تقریبات میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھی اور وہیں قلم قبیلہ کے ہاسٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر امیر الدین، پروفیسر برکت، محترمہ شبینہ رفعت، افضل مراد اور میں وہیں ان سے ملنے گئے اور رات بارہ بجے تک عالمی لٹریچر، پنجابی اور بلوچی ادب کی صورت حال، ترقی پسند ادب اور ادبی تحریکوں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اگلی صبح مجھے افضل توصیف کو میر عبداللہ جان جمالدینی کے پاس لے جانا تھا اور گیارہ بجے اسے واپس قلم قبیلہ پہنچانا تھا جب کہ ڈاکٹر صاحب کی ڈیوٹی اپنی بیگم کو ایئر پورٹ پہنچانے کی تھی۔

چنانچہ اس اتوار کو ''بلوچستان سنڈے پارٹی'' میں ہماری اجتماعی ملاقات کا کوئی امکان نہ رہا۔ چھٹی کا باقاعدہ اعلان ہوا۔

اگلی صبح نو بجے ہم یعنی محترمہ افضل توصیف' میں' پروفیسر برکت علی اور محترمہ شبینہ رفعت ایک پرائیویٹ ہسپتال میں افغانستان سے آئے ہوئے ممتاز بلوچی ادیب و ماہرِ لسانیات جناب عبدالرحمٰن پہلوال کی عیادت کے لیے گئے۔ آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ رہ کر ہم ماما عبداللہ جان کے گھر گئے اور وہاں سے گیارہ بجے دوستوں کو واپس پہنچا کر میں بارہ سوا بارہ بجے گھر پہنچا۔ اور ٹھیک ساڑھے بارہ بجے فون پہ جناب امیر الدین کے حادثے کے سور پھونکے جانے والی اطلاع ملی۔ اس کے نوکر نے کہا کہ وہ سخت زخمی ہے اور بے ہوشی میں بار بار آپ کو بلا رہا ہے۔ دس پندرہ منٹ میں جب ہسپتال پہنچا تو وہ پہلے ہی شعبہ حادثات سے نیوروسرجری وارڈ بھجوایا جا چکا تھا۔ نبض نہ تھی، بلڈ پریشر نہ تھا، محض سانس تکلیف دِہ طور پر چل رہی تھی۔ سخت بے چین تھا، تڑپ رہا تھا۔ آکسیجن کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ای این ٹی کے ڈاکٹر سلطان نے ناک کی پیکنگ کر کے خون بند کر دیا...... ڈیوٹی پر موجود نرس ہنگامی حالت میں اس عجیب و غریب مریض کو بچانے میں لگی تھی۔ یہاں کا اپنا ڈاکٹر موجود نہ تھا، میں جنرل سرجری کے رجسٹرار کو ساتھ لایا کہ کسی طرح نبض کی بحالی کی سبیل ہو سکے اور نیوروسرجن کچھ کر سکے۔ ہم چار پانچ لوگ اُس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک ایسے شخص کی موت سے لڑائی میں اُس کی کمک میں سرگرم تھے، جس نے ساری زندگی، زندگی کے افتخار کے لیے کام کیا تھا۔ ہم اپنا علم، موت و زیست کی جنگ میں مصروف اُس شخص پہ نچھاور کر رہے تھے جس نے سیکڑوں ہزاروں بلوچستانیوں کو علم کے نور سے منور کر دیا تھا۔ ہم ڈرپ اور انجکشن لگانے اس انسان کے وہ پیر چھو رہے تھے جو ہمارے حقوق کے لیے سرزمین بلوچستان کے کونے کونے گھومے تھے۔ ہم جنون کی حد تک اس مجنوں کو بچانے میں لگے ہوئے تھے، جس نے حوا کی بیٹی کی تکریم کے احیا کے لیے پاگلوں کی طرح جدوجہد کی تھی...... اس کی نبض کی بحالی کے لیے یہ ساری تگ ودو، یہ ساری بھاگ دوڑ ناکام ہوئی اور آدھ گھنٹہ کے اندر ایک متحرک، فعال اور خندہ و برشکندہ زندگانی ابدی خاموشی میں ڈھل گئی اور ایک ہی سیکنڈ میں اس کے معالج، اس کے لواحقین بن چکے تھے۔ رو رہے تھے اور ایک

دوسرے کو خاموش کروا رہے تھے۔

غیبے

زئیوں، رندوں، رئیسانیوں، احمد زئیوں، بگٹیوں، مریوں، لانگووں، گچکیوں، بلیدیوں، محمد حسنیوں، ناصروں اور لونڑیوں میں زبردست خدمات سرانجام دینے پر ملک الموت کو انعام کی صورت میں ڈاکٹر سید امیر الدین عطا کر دیا گیا تھا۔ شایانِ شان انعام! بلوچستان آتے جاتے ملک الموت پر بلوچستانی ثقافت کا اتنا اثر ہوا کہ اُس نے قبیلے میں موجود سب سے بہادر، متحرک اور نام ور دشمن کو قتل کر ڈالا۔ وہ اپنے اس انتخاب پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اپنے محبوب ترین دوست کے بسترِ مرگ پہ موجود میری شدید تنہائی کے احساس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو شخص ہمہ وقت ہنستا تھا۔ چھیڑتا تھا، تکرار کرتا تھا، کام کرتا تھا اور ہاتھ بٹاتا تھا، آج خود اپنے بے شمار کام میرے کندھوں پہ چھوڑ کے چلتا بنا۔ جو شخص آخری سانسوں میں میرا نام لے رہا تھا، اب میرے پکارنے، چیخنے، رونے، دھاڑنے پہ ٹس سے مس نہ ہو رہا تھا۔ نہ چھٹی کی درخواست، نہ موت کا کوئی نوٹس۔ اس کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کی خبر ذمہ داری کے ساتھ اس کے دوستوں تک پہنچانا فوری کام تھا۔

کون الفاظ ڈھونڈے اور کون اس پہلو دار شخص کے دوستوں کا سراغ لگائے! سو جو یاد آیا، جس کا نمبر پاس تھا، اسے ملک الموت کی چیرہ دستی کی شکایت پہنچا دی۔ بھلا کون امیر الدین کے اس باؤنسر کے لیے تیار تھا؟۔ دو طرح کے اس کے دوست تھے شہرِ جاناں میں: ایک وہ جنہیں زندگی کا طویل و پیچیدہ پراسیس جسمانی و ذہنی طور پر اتنا اکھاڑ پچھاڑ چکا تھا کہ انہیں سینئر دوست کہا جاتا ہے۔ اور دوسری کیٹیگری ان دوستوں کی ہے جو ابھی نہ گرم دیدہ ہیں نہ سرد چشیدہ، اپنی لااُبالی میں مست ہیں۔ سوا اِس کریہہ موقع پر موجود ہونے، صلاح مشورہ میں حصہ دار بننے اور حتمی فیصلوں کی رسائی تک ساتھ ہونے کے قابل دو چار ہی تو لوگ تھے۔ ارے امیر الدین، اس بے وقت کی کارروائی سے تمہیں کیا ملا؟۔

سول ہسپتال کے شعبہ حادثات میں موجود ڈاکٹروں کی انتہائی محبت اور پیشہ ورانہ بھائی

چارے کے جذبے نے کئی مسائل حل کر دیے۔ سرکار سوشل سیکٹر سے کب کا ہاتھ کھینچ چکی ہے، لہٰذا مردہ خانے کا کیا انتظام ہوگا۔ انہی ڈاکٹروں نے کاسی کیژوئلٹی کے آپریشن تھیٹر کے ایک کونے کو مردہ خانہ بنا ڈالا۔ (واضح رہے کہ بلوچستان میں سماجی خدمات کی یہ واحد بڑی عمارت ہے جو کسی فرد نے انسانوں کی خدمت کے لیے وقف کی ہو اور اس عظیم فرد کا نام عبداللہ جان کاسی تھا)۔ جیئند اور شیھک برف کی سلیں لائے۔ ایک پیڈسٹل پنکھا بھی کسی سے پکڑ لائے اور اس طرح سرکاری دیواری پنکھے اور ایک پیڈسٹل فین کی مدد سے برف کی سلوں نے میرے یار کے لیے سردخانے کا کام کیا۔ امیر الدین کے سینے کی آگ کی حدت جو تباہی لا چکی تھی، اب اس کے بعد برف کا انتظام کتنا غیر ضروری لگتا تھا۔

پروفیسر برکت علی، طاہر محمد خان، سرور جان، دوستین، جیئند، شیھک، سیف الدین بوہرہ...... سب دوست آ چکے تھے۔ ہر چہرہ مرجھایا، ہر آنکھ آبدیدہ۔ ہم چار بجے تک کراچی سے ڈاکٹر صاحب کے عزیزوں کی طرف سے پوسٹ مارٹم کرانے یا نہ کرانے کے فیصلے کا انتظار کرتے رہے۔ دوسرا بڑا معاملہ اسے کوئٹہ یا کراچی میں دفن کرنے کا تھا۔ وہ بھی ہم نے اس کے بیوی بچوں پر چھوڑ دیا۔ اگر وہ کراچی کا کہتے تو وہاں تک پہنچانے کا انتظام کرنا تھا۔ اگر وہ کوئٹہ میں تدفین کی اجازت دیتے تو کاسی قبرستان یا سریاب میں سے کسی کا انتخاب کرنا تھا۔ چنانچہ دونوں باتوں کے لیے ضروری تیاریوں کا جائزہ لینے لگے۔

طاہر محمد خان مجھے ساتھ لے کر مولانا عمر فاؤنڈیشن کی ایمبولینسوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں ایئرکنڈیشن گاڑیاں نہ تھیں۔ سادہ گاڑیاں سب کی سب حاضر۔ مولانا مرحوم تو ہم سب کے اکابرین میں سے تھا۔ ساری زندگی علم دوستی کرتا رہا۔ ساری زندگی سامراج دشمنی کرتا رہا۔ اس کے نام نامی سے منسوب فاؤنڈیشن ہمیشہ سے ہماری نظروں میں قدر و شرف کا مرکز رہا ہے۔ بڑا آدمی تھا مگر بڑے بلوچستان میں گم ہو جاتا، اگر اس کے اپنے فرزند اس کے نام کو زندہ نہ رکھتے۔ اس کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے، شالا۔

اسی اثنا میں کراچی میں موجود اُس کے خاندان والوں (اُس کی بیگم ثریا، بیٹی منیزہ اور بیٹی

عائشہ۔ بیٹا دارا پاکستان سے باہر امریکہ میں محنت مزدوری کرنے گیا ہوا تھا) نے مجھے فون کر کے پوسٹ مارٹم نہ کرانے کا حکم دیا۔ بہت بحث و مباحثہ کے بعد تدفین کے لیے کراچی کا انتخاب کیا۔ اور مجھے اُس کی میت کراچی لے آنے کی ہدایت کی۔

عبدالستار ایدھی نے پتہ نہیں کس کس سے روزی کے ہیچ ذرائع چھین رکھے ہیں۔ دنیاوی جھمیلوں میں غرقاں کبھی کبھی آپ بہت ہی اہم باتیں بھی نوٹ نہیں کر سکتے۔ ایدھی سنٹر نے ہمارے دوست کو غسل دلایا، فارملین لگایا، کفن لپیٹا، تابوت میں ڈالا اور نماز جنازہ پڑھوائی...... بہت احترام کے ساتھ، بہت ملائمت، اپنائیت کے ساتھ۔ اب میں سمجھا کہ ملاّ اور ایدھی کی دوستی کیوں نہیں بن رہی۔

ڈاکٹر شمیم درانی سول ہسپتال کا ایم ایس ہے۔ طاہر محمد خان نے اس سے ایمبولینس مانگی۔ ہماری اس سے ذاتی شناسائی نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے محض میڈیکل پیشے سے اپنی وابستگی اور حالیہ ذمہ داری بتائی...... بغیر کسی اگر مگر کے اس نے ''وی آئی پی'' ایئرکنڈیشنڈ ایمبولینس ہمیں دے دی۔ نہ ''صاحب سویا ہوا تھا'' اور نہ ہی کسی ضروری ''میٹنگ میں مصروف تھا''۔ نہ ''حکام بالا سے اجازت'' کا ڈرامہ ہوا۔ نہ ''درخواست بھروانے'' کی کاروائی ہوئی۔ اور نہ ہی ''گورنر وزیر کو ضرورت پڑنے'' کا خدشہ جتلایا۔ وہ زندہ باد ہوں۔

سفر کے لیے ضروری سامان لینے گھر پہنچا تو گیٹ پہ خود کو بہت نارمل اور کمپوز بنا کر داخل ہوا۔ مگر میں غلط سمجھا تھا۔ امیر الدین کی موت سے میرا پورا گھرانہ مغموم تھا۔ ہر بچہ کہہ رکھا تھا کہ '' مجھے بڑے بھائی کی جگہ سمجھو''۔ میری والدہ کی عیادت کے لیے میاں بیوی کا تسلسل سے آنا جانا، دعوتوں، میٹنگوں کے سلسلہ میں آمدورفت، ٹیلی فون پہ اکثر ہماری بات چیت...... بچے انہی چیزوں سے تو اپنائیت لیتے ہیں۔ سال دو سال قبل میرے بڑے بیٹے کی شادی پہ وہ میرے گاؤں ماوند تک آیا تھا۔ میرے بڑے بھائی میرو خان سے بہت پیار کرتا تھا، اس سے بحثیں چھیڑتا تھا، ہنستا ہنساتا تھا۔ حال ہی میں دعوت پہ میرے گھر آیا تو واپسی پہ میرے بھتیجے کے جوتے کو اپنا سمجھ کر پہن گیا۔ تین دن بعد ہی بھائی صاحب کو احساس ہوا کہ جوتے اپنے نہیں ہیں۔ میرے نواسے کی پیدائش پہ

مبارک باد کے لیے آیا۔ میرے گھرانے کے ایک ایک فرد کو جانتا تھا۔ اُسے ہمارا بلوچی لباس کلچر بہت پسند تھا۔ اپنی ہنس مکھ طبیعت میں جیسے وہ گھر کا فرد ہو۔ چنانچہ میری بناوٹی لاتعلقی بے کار گئی اور میرے گھر میں اس ''محبوب انکل'' کی موت کا غم مکمل طور پر طاری تھا۔ اسی محبت پہ ہزاروں لوکل سرٹیفکیٹ قربان ہوں۔

ہماری بڑی خواہش تھی کہ امیر الدین یہیں بلوچستان میں دفن ہو۔ جس شخص نے سوئی، لورالائی اور پھر کوئٹہ، سریاب میں 30,25 برس تعلیم کا نور پھیلایا ہو، جس نے اپنی شناخت بلوچستان بنالی ہو، جس کے دوستوں کی اکثریت کا تعلق اس سرزمین سے ہو، جس شخص کا ہیرو غوث بخش بزنجو ہو، جس کے ساتھی عبداللہ جان وخدائیداد ہوں، جس نے بلوچستان میں انسانی حقوق کی سربلندی پہ باقاعدہ جدوجہد کی ہو اور جو شخص پوری زندگی یہاں کے افتادگانِ خاک کو معزز ومعتبر بنانے کی لڑائی لڑا ہو...... اس شخص کو تو یہیں اسی سرزمین کے عین دل میں دفن ہونا چاہیے تھا، ہمارے ساتھی کی حیثیت سے، ہمارے بزرگوں کے درمیان۔

مگر ہمیں اس کے خاندان کی خواہش کی تکمیل میں کراچی روانہ ہونا پڑا۔ چوں کہ امیر الدین اب زندہ نہ تھا اس لیے پہلی بار مجھے فرنٹ سیٹ پہ جگہ ملی۔ اور امیر الدین پہلی بار نمبر دو کی حیثیت قبول کرنے پہ تیار ہوا تھا۔ وہ پچھلی نشست پہ لکڑی کے تابوت کے اندر برف کے ٹکڑوں میں بے حس وحرکت پڑا تھا...... پھر بھی مرکز تو وہی تھا، سب کچھ تو اسی کی شخصیت کے گرد گھوم رہا تھا۔ وہی رلا رہا تھا، وہی سرد آہیں ہچکیاں بھروا رہا تھا۔ وہی خود کو یاد کروا رہا تھا، اپنی تعریفیں کروا رہا تھا۔ ہم پھر اس عامل کے معمول بن گئے تھے...... ایسا لیڈر تھا امیر الدین جو مر کر بھی ہمیں ہانکے جا رہا تھا۔

یہ سفر اپنی نوعیت کا منفرد سفر تھا۔ اُس کا ساتھ تو تھا مگر نہ تو اُس کے معاشقوں کے قصے تھے نہ شاعری تھی، نہ لطیفے، نہ بحث مباحثہ۔ نہ پروگریسو رائٹرز، نہ عوام الناس کی غربت وافلاس سے نجات کی باتیں...... بس ایک حتمی خاموشی تھی۔ ہمارے سفر کا امیر کچھ بھی نہ بولتا تھا۔ میرا راہنما مزدوروں غریبوں کے لیے اپنی خدمات پہ مطمئن تابوت میں لیٹا تھا۔ اب نہ وہ یہ جانتا تھا کہ یہ مستونگ وکھڈ کوچہ ہے جہاں لانگو قبیلہ کے غریب ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے پر لگا دیے گئے

ہیں، نہ اب اسے یہ خبر تھی کہ یہ قلات ہے جو ایک جمہوری خوش حال اور ترقی پسند معاشرے کا ہیڈ کوارٹر بننے کے بجائے پستی وپسماندگی کا نشان ہے۔ وہ اس پہ بھی خاموش تھا کہ رابعہ کی خضدار یونیورسٹی کے بچے نہ تعلیم پاتے ہیں، نہ روزگار۔ آج امیر الدین حب کے شہر میں بلوچستان کی تباہ ہوتی ہوئی صنعت اور بے روزگار ہوتے ہوئے مزدوروں کے بارے میں کسی تقریر کا نہیں سوچ رہا تھا...... اس قدر اچھے ہم سفر کے ساتھ اس قدر بور سفر...... میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بلوچستان کی سڑکوں کا ایڈز، تو انڈیا کی فلمیں اور گانے ہیں۔ ذرا سا بڑا ہوٹل آیا، وہیں پہ یہ زہر دستیاب ہے۔ بلوچستان میں جاری قبائلی جنگوں کی تعداد میں اضافہ کرنے اور انہیں پرتشدد بنانے میں ان فلموں گانوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہماری سڑکوں پہ نہ مست وجوانسال ہوتے ہیں، نہ مہناز وتوکلی۔ بیورغ، چگھا، عبدالعلی، شہ مرید، نورا، نورل، حانی سمو کچھ بھی نہیں...... ہماری سڑکیں بانجھ ہیں۔ وہاں صرف ہندوستانی فلموں کی ننگی عورتیں واہی تباہی مچاتی ہیں، جن کا ہیرو عبدالقدیر خان ہے اور جہاں کا ولن ابوالکلام۔ نہ امین کھوسہ ہے نہ بزنجو، نہ بخت نامہ، نہ گل بی بی۔ ہم سے ہماری ثقافت کی برکت، ہم سے ہمارا بھاری پن بے دردی سے نوچے جا رہے ہیں۔ 500 میل میں کہیں بھی بلوچ دست کاری کی دکان نہیں، کہیں بھی بلوچ نیک آدمی کا مجسمہ نہیں، کہیں بھی بلوچ کا چنگ، سریندا، شفیلی، دونلی نہیں بکتے...... یا تو آپ کو پسماندگی کی مکروہ علامت کے بطور ایک تنہا کھڑی بلوچ جھونپڑی نظر آئے گی یا پھر ضیا الحق اور عرب شیخ کے مدرسے ملیں گے، پولیس تھانے یا فوجی چوکیاں نظر آئیں گی یا پھر ہوٹلوں، پنکچر کی دکانوں، بسوں، ٹرکوں اور سگریٹ کی دکانوں میں ہندوستانی لچر اور پرتشدد گانے۔ کہیں کہیں البتہ آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کرنے والے ایدھی سنٹر نظر آئیں گے۔ ان کی ایمبولنسیں دوڑتی پھرتی نظر آئیں گی۔ باقی سارا دیس ملاؤں کا ہے، سارا وطن وار لارڈز کا ہے۔ کوئی امیر الدین نہیں، کوئی عنقا نہیں، آزاد نہیں، گل خان نہیں، مراد ساحر نہیں...... سب کو تاریک ترین قوت نگل گئی۔ یہ سارے مسیحا، ہتھکڑیوں جولانوں کی صلیبیں اُٹھائے یروشلم بلوچستان کی گلیوں میں گھمائے گئے اور کلوری کے پہاڑ پہ معدوم ہوئے۔

بلوچستان کی سڑکیں یا تو کراچی کے رجعتی صنعتی شہر سے آتی ہیں یا پھر پسماندہ، قدامت

پرست انگریزی کیمپ فالوئرز کے شہر کوئٹہ سے۔اس لیے وہاں سے سائنسی سوچ، آزادانہ تفکر اور شعور وآ گہی کی آمدورفت کا امکان تک نہیں۔ یہی عقیدتی بنیاد پرستی، قبائلی بنیاد پرستی میں بری طرح خلط ملط ہو کر مستقبل کے بلوچستان کی تشکیل کر رہی ہے۔

امیر الدین کی بارات میں کل تین گاڑیاں تھیں۔اس بارات پہ پھول تھے نہ سجاوٹ۔ یہ ساری ماتمی گاڑیاں تھیں۔ایک میں وہ خود جلوہ افروز تھا، دوسری ایدھی صاحب کی ایمبولینس تھی اور تیسری ظفر ہاشمی کی موٹر کار۔اور براتی بھی کیا براتی......ایک فقرہ کہو تو باجماعت رو پڑیں۔ برکت بھی بھلا کوئی براتی ہے؟۔ پہلے ہی لیفٹ کی سیاست پہ مسلط دائمی یوم عاشور پہ سینہ پیٹتا رہتا ہے۔ اب ایک اور چلتن امیر الدین مر گیا تو برکت میں بچا کیا ہے؟ ایک سرور آغا، جو نیشنل ورکرز پارٹی کا صوبائی کنوینر ہے، پہلے ہی چبا چبا کر بات کرتا ہے آج تو دین کے امیر نے زبان بندی ہی جاری کر دی، تیسرا باراتی ظفر ہاشمی ہے۔زور سگریٹوں پر، بار بار پانی پیتا ہے، اپنے پسندیدہ موضوعات کے ہاتھوں مجبور، امیر الدین کے دسیوں معاشقوں کے قصے سنانے لگتا ہے۔مگر حاضرین کو بہت ہی رنجیدہ دیکھ کر جھینپ جاتا ہے۔سوٗ خاموشی۔امیر الدین نے ایک بار بھی سر اٹھا کر نہ کہا،''ارے بھئی کچھ بولو بھی''۔

پوری رات سفر میں یادِ یار کی زلف کے تاروں کو سہلاتے گزری اور صبح چھ بجے ہم کراچی میں داخل ہوئے۔موبائل فون نے کام کرنا شروع کر دیا۔موبائل پہ احمد بن محمد کے اس استفسار پہ کہ تم لوگ کہاں پہنچے ہو، ہم انہیں بتا رہے تھے کہ یہ کراچی ہے یا کلاچی ہم تو سسی کو اس کی ریت میں گاڑنے پہنچ گئے۔لوگ محبوبہ کی محبت میں موبائل خریدتے ہیں اور ہم محبوب کی جدائی کی خبر نشر کر رہے تھے۔

ہمارا استقبال پاکیزہ اور خالص ترین آہوں، سسکیوں سے ہوا۔ہم ایک لمحہ دریار پہ رک کر پھر ایدھی صاحب کے دربار پہنچے کہ ظہر تک میت اس کی امانت گاہ میں رکھنے کا حکم ہوا۔اس کے ایئر کنڈیشنوں سے یخ کردہ امانت گاہ میں بیسیوں بے نام اور نامعلوم مسافر پہلے ہی موجود تھے جو سب کے سب نچلے طبقے کے تھے۔واپس ماتمی گھر آئے، کچھ دیر سوگوار خاندان کے ساتھ درد بانٹتے

رہے۔اور پھر......، اصحابِ کہف آ گئے: احمد گلے مل کر رو یا، راحت نڈھال، شمس بے حال اور ڈاکٹر شمیم کا اترا چہرہ۔امیر الدین کمیونسٹ اخلاقیات کے بنیادی اصولوں کا احیا کروا چکا تھا۔

اس کی موت کی اطلاع لاہور میں اس کی پارٹی کے ملک محمد اسلم کے توسط سے وہاں کے دوستوں تک پہنچائی۔ملتان ملک محمد علی کو بتایا، سن کر جیسے سینے میں مکا لگا ہو۔امیر الدین کے جنازے میں اس کی نیشنل ورکرز پارٹی کا سیکرٹری جنرل یوسف مستی خان موجود تھا۔ملتان پارٹی کا صدر سعید احمد ایڈووکیٹ کھڑا تھا، مسلم شمیم تھا، حسن عابد تھا، مظہر جمیل تھا، اعیز تھا، پائلر، ایمنسٹی، ہیومن رائٹس، پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن، پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن، وکلا اور بے شمار اُس کے ذاتی دوست موجود تھے۔

امیر الدین آج اپنے جنازے کی اگلی صفوں میں کھڑے بہت سے نماز نہ پڑھنے والے دوستوں کو جانتا تھا مگر اس روز کسی بھی بے تکلف دوست کو اس نے اس بھیس میں آنے پہ وہ گالی نہ دی جس کا متضاد لفظ 'حلالی' ہوتا ہے۔ایک بار بھی ملاّ کی شان میں گستاخی نہ کی۔ ساری عمر محکوم انسان کے پیروں کی دھول صاف کرتے رہنے والا یہ شخص آج اپنے اوپر منوں مٹی ڈالنے والوں سے کوئی احتجاج نہ کر رہا تھا۔نہ ہی وہاں موجود لوگوں کو یہ پیغام دے رہا تھا کہ ''میرے آدرش' میرا نام' میرا پرچم، اب تمہارے حوالے' اس کی سربلندی سرفرازی اب تمہارا کام''۔

مگر یہی سرگوشی تو کوئٹہ کی ہوا ایک دن قبل ہی سندھ و ہند تک پہنچا چکی تھی۔

پرومیتھیس دیوتا کے اچھے شاگرد! تم نے بلوچستان میں علم کا نور پھیلایا تھا' بلوچستان تمہارے علم کا گاؤن عبدالعلی اخوندزادہ کے چوغے کے ساتھ محفوظ کر دے گا۔ یہ سرزمین، احیائے شرفِ انسانی کے تمہارے عظیم مشن کے نقارے کو پیرک کے سریندا کے ساتھ کوہِ جاندران کی بلندیوں پہ رکھے گی جہاں جمعہ کی شب فرشتے اس پہ امن کی، جیون کی، شانتی کی اور اُمید کی دُھن بجاتے رہیں گے اور پوری کائنات سنتی رہے گی......تا ابد۔

ڈاکٹر فہمیدہ حسین

فہمیدہ حسین کی جو سب سے اچھی کتاب مجھے لگی وہ ’’شاہ لطیف کی شاعری میں عورت کا کردار‘‘ ہے۔ اسی کتاب نے مجھے پہلی بار سنجیدگی سے شاہ کی طرف متوجہ کیا۔ اسی کتاب نے مجھے توکلی مست کی عظمت کا صحیح ادراک بخشا۔ تین ساڑھے تین سوصفحات کی اس کتاب نے مجھے سبق دیا کہ زندگی کا ارتقا اور اس ارتقا میں محنت کرنے والے ہاتھوں کا سارا کھیل یورپ میں کم اور خود ہمارے اپنے خطے میں زیادہ رہا۔ یہیں پہ مسلسل تبدیلی کی جُہد ہوتی رہی؛ یہیں پہ نظریات کا فروغ ہوا، اور یہیں پہ محنت کی عظمت کے گن گائے گئے ....شاہ لطیف کی زبانی، مست توکلی کی زبانی۔

اور یہ کتاب مجھے بھیجتے ہوئے اس پہ فہمیدہ حسین نے اپنے قلم سے بہت ہی خوب صورت فقرہ لکھ کر بھجوایا: ’ادا‘ شاہ محمد مری............

اس کی دوسری کتاب بھی میں نے شاہ لطیف ہی کے بارے میں پڑھی۔ ڈیڑھ سوصفحات پر مشتمل اس مختصر مگر بہت ہی اہم کتاب کا نام ہے: حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائیؒ شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر صاحبہ نے یہاں اُس پوری سوچ کو مسترد کر دیا، جس کے تحت ایسی بڑی ہستیوں کے پیغام کو تو دفن کر دیا جاتا ہے اور انہیں بس میلہ ٹھیلہ، عرس تماشا اور چادر چڑھائی اور سیمینار بازی کے حوالے کیا جاتا ہے۔ فہمیدہ، شاہ لطیف کو بزرگ اور ولی اللہ کی بہ نسبت ایک فلسفی، دانش ور اور نظریہ دان گردانتی ہے۔

5 جولائی 1948ء میں ٹنڈو جام میں پیدا ہونے والی فہمیدہ مجھ سے سات سال بزرگ ہیں۔ وہی ٹنڈو جام جہاں ستر کی دہائی میں ہم طلبا تنظیم منظّم کرنے کا ذکری بلوچوں جیسا چوگان کرتے رہے۔ اور دیکھیے وہ ہماری محنت کے بغیر ہم سے رابطے کیے بغیر انہی نتائج پر پہنچ گئی جنہیں پہنچانا بس ہم نے اپنا فریضہ اور ٹھیکہ قرار دیا تھا۔ مطلب یہ کہ سرگرم نظریات بہت ہی متحیر کرنے والے راستوں طریقوں سے سفر کرتے ہیں اور مناسب ذہن تلاش کر کے وہاں لینڈ کرتے ہیں۔

فہمیدہ کا ذہن انسان دوست افکار سے منور ہے۔ اسے اپنی مادری قومی سندھی زبان سے محبت سکھا دی گئی۔ وہ سندھی کی لسانیات کی ماہر اور فریفتہ ہے۔ والد ہفت زبانی عالم تھا، اس لیے ہر لفظ کے آباؤ اجداد اور نسلی وابستگی بچوں کو ذہن نشین کراتا رہا۔ باپ کی وہی توجہ بیٹی کے کام آیا، اس قدر کہ وہ ایک ممتاز اور قابلِ رشک دانش ور، استاد اور مفکر بن گئی۔ ایک روشن فکر اور بشر دوست باپ نے اوروں کو تو مترقی بنا ہی دیا مگر اولاد پر توجہ دے کر اس نے ایک اچھے انسان ہونے کا ثبوت بھی دے دیا۔

فہمیدہ نے بچپن سے ہی بچوں کی ایک کہانی ’کائیر بادشاہ‘ چھپوا کر لکھنا شروع کیا۔ پھر تو وہ کئی رسالوں کے ادبی حصے کی ایڈیٹر بن گئی: بادل، سگھڑین سٹھ، جاگو، کلاچی ......

اُس کا بھائی بہت ادب دوست اور ادب نواز رہا ہے۔ سراج اس کا نام ہے۔ اور چوٹی کے سندھی مترقی ادیب و دانش ور اس کے ذاتی دوست رہے۔

فہمیدہ نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ نوکری کے لیے کوشش کی تو سماج کی ناانصافیاں بہت ہی حقیر اور بدصورت انداز میں اس کے سامنے آئیں۔ بالآخر وہ استاد بن گئی۔

اور اپنی میٹھی ماں بولی سندھ کی سرکاری طور پر خدمت گذار بن گئی۔

فہمیدہ شاعری کرتی ہے، محقق ہے، اچھی نقاد ہے اور شاہ لطیف پر تو اس کا کام انتہائی قابلِ قدر ہے۔ اس نے پی ایچ ڈی بھی شاہ لطیف پر کی ہے اور وہ بھی عورت کے بارے میں شاہ کے رویے پر۔

محمد سرور

ہمارے دوستوں میں ایک میٹھے اور اچھے دوست کا نام غلام سرور ہے۔ اونچا قد، سیلف میڈ لوگوں والا بے ڈھب و بے بناوٹ چہرہ۔ بابا آدم کے زمانے کے نیلے سکوٹر پر سوار سرور، اب ملازمت سے ریٹائر ہے۔ وہ ایکس رے ٹکنیشن ہے اور میرے استاد، ڈاکٹر مالک کاسی، سابق وفاقی وزیر صحت کی کلینک میں کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جب وزیر بنا تو سرور خان کا نوکر ڈیڑھ خان بننے کے بجائے الٹا بے روزگار ہو گیا۔ چلتے ہوئے کلینک کا مالک تو وزیر بن کر اسلام آباد چلا گیا اور سرور بلند و بالا خواب ہی دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ پھر اس کی دید بھی مدھم پڑ گئی کہ آنکھوں میں کیٹریکٹ ہو گیا۔ بس یہ ہوا کہ ڈاکٹر مالک نے اس کا مفت علاج اسلام آباد میں کرایا اور عینک آنکھ کے اندر ہی لگوا دی۔

میں جب پوسٹ گریجویشن کرنے لاہور گیا تو وہاں اپنی سیاسی پارٹی کی طرف سے ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' لاہور سے وابستہ کر لیا گیا۔ یہ رسالہ بلوچستان بھی جاتا تھا اس لیے کہ یہ ہماری پارٹی (پاکستان سوشلسٹ پارٹی) کا ترجمان ہفت روزہ تھا۔ بلوچستان کے دوستوں کی فرمائش پر ہمارا رسالہ ''سرور، معرفت کراؤن آٹوز کواری روڈ کوئٹہ'' والے پتے پر بھی جانے لگا۔ پہلے ایک' پھر دو اور پھر ہم چھ آٹھ دانے اُسے بھجواتے رہے۔ اس طرح اُس سے ملنے کا بہت اشتیاق ہوا۔

مگر سرور سے ملاقات کہیں جا کر 1990ء کے آخر میں ہوئی، جب میں تعلیم مکمل کر کے واپس کوئٹہ آیا۔ ملاقات کا اڈہ تو ظاہر ہے ڈاکٹر خدائیداد کا ''پریم مندر'' ہی تھا۔ لیکن ہم دونوں وہاں

سے پھر جا کر سریاب پھاٹک والے دکانی بابا ہوٹل میں بیٹھ گئے اور دیر تک باتیں ہوئیں۔ جو آج تک جاری ہیں۔ (یہ بدبخت گفتار' کردار میں ڈھلتی ہی نہیں' کتنا مشکل ہے علم کو عمل میں ڈھالنا!)۔

سرور کی روایتی تعلیم ایف اے تک ہے۔ میری طرح وہ بھی ایک وقت جمعیت علمائے اسلام سے وابستہ ہو گیا تھا۔ مجھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہاں سے چند ماہ کے اندر اندر نکال دیا۔ مگر سرور کی عدم سریع الحرکتی عادت نے اُسے دیر تک وہیں پھنسائے رکھا۔ ہوا یوں کہ 1969ء میں اس نے نوکری کر لی۔ اس کی پہلی پوسٹنگ نوشکی میں ہوئی اور وہیں وہ جے یو آئی کے ملاؤں میں بھرتی ہو گیا۔ سرور 1973ء تک یعنی چار برس تک ملا بنا رہا۔

اس نے 1976ء میں وردکوں میں شادی کی۔ آدھی ارینج اور آدھی محبت والی شادی۔ لڑکا لڑکی میں انڈرسٹینڈنگ ہوئی اور دونوں نے اپنے والدین سے منظوری لی۔

اتفاق دیکھیے کہ سرور کے سسرال میں غلام جیلانی وردک نامی شخص، پرویزی تھا۔ اس کی صحبت میں رہ کر سرور بھی پرویزی بن گیا۔ وہیں 78-1977ء میں اُس نے بالشویزم کا نام اقبال کے حوالے سے پڑھا۔ کچھ کچھ مارکسزم پڑھنی شروع کی۔ مگر اسے ''کلٹی'' کر دیا گورکی کے شہرہ آفاق ناول ''ماں'' نے۔ گورکی جو انسانیت کا عظیم محسن ہے۔ اس کی تحریروں نے لاکھوں ترہ کیوں کو نور بخشا، سروروں کو سروری عطا کی۔ کتنے لوگ ہوں گے دنیا میں جن کی شخصی زندگی میں گورکی کا حکم چلتا رہا!۔

پھر سرور کی شناسائی کچھ ماؤ پرست کمیونسٹوں سے ہوئی۔ وہ اُسے اپنے سٹڈی سرکلوں میں بٹھانے لگے۔ جہاں اُس نے پشتو میں ماؤ کی کتابیں پڑھیں اور مارکسی فلسفہ کی ورق گردانی کی۔ اور وہیں اس نے سی آر اسلم کا نام سنا۔ (پتہ نہیں تعریف میں یا دشنام کی برسات میں!!)۔

پھر جب وہ کوئٹہ کے ٹی بی کلینک میں ایکسرے ٹکنیشن تھا، وہیں پر ڈاکٹر معصوم کاسی میڈیکل آفیسر تھا۔ دونوں کی گپ شپ اور بحثیں ہوئیں۔ تب ڈاکٹر کاسی اُسے اپنے دوسرے دوستوں سے ملانے خدائیداد کے پاس لے گیا اور اس طرح سرور، سی آر اسلم کے بلوچستانی دوستوں سے آشنا ہوا۔ وہ پاکستان سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوا اور اُس کی سوشلسٹی کا یہ سفر آج تک جاری

ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کبھی کبھی نہیں، بلکہ اکثر اپنی نئی سیاسی لائن یعنی بینوولنٹ ڈکٹیٹر شپ سے ہماری دل آزاریاں کرتا رہتا ہے۔ (انسانی فکر کا جوار بھاٹا، اس کی ندرت وقدرت اور اس کی سمت و رفتار کتنی دلچسپ ہوتی ہے!) مگر ہمارے لیے ہمارا یہ بوڑھا اور دیرینہ رفیق وہی سرور ہی ہے۔

محمد سرور اصل میں پشین کے علاقہ شادیزئی کا رہنے والا ہے۔ جہاں سے اُس کا دادا پر دادا جھگڑ کر قندھار آباد (جلاوطن) ہوا۔ اس کا والد پندرہ برس کی عمر میں واپس کوئٹہ آیا اور یہاں پر فروٹ مارکیٹ میں مزدوری کرنے لگا۔ آغا لال محمد نام تھا اس کا، لیکن وہ سپین آغا کے نام سے مشہور ہوا۔ (رنگوں کے عمل دخل ہی نے تو انسان کو حیوان سے اشرف بنا ڈالا، اور امریکہ وجنوبی افریقہ میں اشرف سے درندہ) یہیں فروٹ مارکیٹ میں اس نے کلی گل محمد کے رہائشی ایک شخص کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اور وہیں رہنے لگا۔ سرور کی دو بہنیں حیات ہیں، ایک اور چھوٹا بھائی تھا جس کا 1977ء میں انتقال ہوا۔ سرور کی معمر اور مہربان والدہ، سرور کے مجھ جیسے دوستوں کے سروں پہ شفقت کا ہاتھ پھیر کر دعائیں دیتی رہنے کے لیے کافی عرصہ تک زندہ رہیں۔

سرور اور اس کی بیگم نے پیسہ پیسہ جوڑا، الماس نامی نواحی گاؤں میں ایک مکان لیا۔ اور اسی میں رہنے لگے۔ 1979ء میں اس نے اپنا بوسیدہ وفرسودہ سکوٹر خریدا۔

سرور بلوچستان سنڈے پارٹی کا بہت ہی سرگرم رکن ہے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے کر سوشلزم کو بہت وقت دینے لگا۔ سرور بحث بہت کرتا ہے، بلند آواز سے کرتا ہے اور دیر تک کرتا ہے۔ بحث میں اس کی ہٹ دھرمی قابلِ معافی اس لیے ہے کہ یہ شخص اپنی بحث میں کم از کم آستینیں تو نہیں چڑھاتا۔ ہم جب اس کے ''نہ مانوں'' والے رویے سے مقابلہ کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو صرف ایک فقرہ کہہ کر اُسے کمال کامیابی کے ساتھ خاموش کرتے ہیں۔ وہ فقرہ یہ ہے: ''ہم آپ سے متفق ہیں!!''۔ تب وہ اپنی خواہ مخواہ والی ضد پہ ہنس بھی دیتا ہے اور جھینپ بھی جاتا ہے کہ ہم نے اس کی بحث کی روانی کو عین اُس وقت ہتھیار ڈال کر ختم کر دیا جب ابھی وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔

سرور اپنے مطلب کی چیزیں پڑھتا ہے۔ ادب کے بجائے فلسفہ سے یاری رکھتا ہے۔ وہ

سیاسی ورکر کے بجائے مطالعاتی ورکر زیادہ ہے۔ سوشلسٹ پارٹی جب نیشنل ورکرز پارٹی میں ڈھلی تو خدائیداد کی طرح اُسے بھی ''مزہ'' نہیں آیا۔ وہ اپنے سوشلزم سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ متحدہ محاذ کی آڑ میں طبقاتی سوچ سے ہٹ جانے کے کسی بھی اقدام میں بہہ جانے پہ راضی نہیں تھا۔ حالاں کہ اُسے قلمی دوستی کا بہت شوق ہے اور ورکرز پارٹی کے لیڈروں سے اس نے دوستی بنا بھی ڈالی، مگر اُس کو نہ اپنی نئی سیاست میں بورژوا گیری اچھی لگ رہی تھی اور نہ اپنے لیڈروں کے کروفر اور ''ٹھشن'' بھرے لچھن مزہ دے رہے تھے۔ ایک بار تو اس کی سوشلسٹ پارٹی 'نیشنل ورکرز سے بھی پیچھے ہٹ کر قومی جمہوری پارٹی بننے لگی تھی۔ اور سربراہی بھی ناشناس لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جا رہی تھی۔

ہوا یوں کہ سرور کی نیشنل ورکرز پارٹی کا ''اور لوگوں'' کے ساتھ انضمام ہو چکا تھا۔ اس کا اعلان بھی ہو چکا۔ اس نئی انضمامی پارٹی کے نام کا بھی پریس کانفرنس میں باقاعدہ اعلان ہو گیا تھا۔ باقی ساری چیزیں بھی طے ہو چکی تھیں۔ بس صرف عہدیداروں کا انتخاب (نامزدگی) باقی تھا، جس کے لیے لاہور میں میٹنگ بھی رکھی گئی تھی۔ چنانچہ سندھ' سرحد اور پنجاب بھر سے ڈیڑھ سو آدمی جہازوں' ٹرینوں اور بسوں کے ذریعے موسم سرما کے دُھند بھرے لاہور میں جمع ہو گئے۔ یہ واحد کام بھی آدھ پون گھنٹہ میں سرانجام پانا تھا اس لیے کہ استقلال نامی پارٹیوں میں ورکر والی نعمت تو کب سے روٹھ چلی۔ اب تو لیڈر ہی لیڈر ہیں' جو کسی ادغام' انضمام' اتحاد سے پہلے ہی عہدوں کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ پھر اگر عہدے اُمیدواروں سے کم پڑ بھی جائیں گے تو مزید تخلیق کیے جاتے ہیں مثلاً صدر کے ساتھ ساتھ رہبرِ اعلیٰ' نگرانِ اعلیٰ' رہبرِ تحریک، چیئرمین، چیف ایگزیکٹو......وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ انضمام مکمل۔ بس رسمی طور پر عہدیداروں کے نام ہال میں موجود سفر کی مٹی میں اَٹے ہوئے ان بے چارے لوگوں کو بتائے جانے تھے جو ابھی تک پسِ دیوار سرگوشیوں سے لاعلم رکھے گئے تھے۔ اسی طرح این جی او والے گروپ کا تو پتہ ہی نہیں کا رکن ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر ہوتا ہے تو کہاں ہوتا ہے' کیا کرتا ہے۔ یہ خواہ کنگ کے ساتھ ہوں یا کوئین کے' ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کے پاس سیاسی ''ماضی قریب'' ہوتا ہی نہیں۔ باقی رہ گئے تھے سرور کے بے چارے ساتھی، تو

انہیں محض جوکر بننا تھا کہ ازل سے عہدہ بازی انہیں سکھائی ہی نہیں گئی۔ نہ ہی ان درویشوں کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ نہ لیڈر شپ انہیں ملتی تھی اور نہ نئے کارکن دستیاب ہونے تھے۔ لہٰذا خسارہ ہی خسارہ، نقصان ہی نقصان۔

سرور اپنے پرانے ساتھیوں کے بچھڑ جانے کا پکا یقین کر چکا تھا اور قطار سے الگ کردہ کونج کی پژمردگی میں پہلے ہی مبتلا ہو چکا تھا۔ اُس نے مٹھی بھر بلوچستانی ساتھیوں کے ساتھ پھر سے تن تنہا اپنے پُنّوں کے اونٹوں کے نقش ہائے پا تلاش کرنے کا فیصلہ کر لینا تھا۔ پھر وہی دشت، وہی جھکڑ، وہی سراب، وہی ریت، وہی پیاس، وہی کم آبی، مشکیزہ، توشہ، پڑاؤ...... کہ ناگمان آسمان کو اس پہ رحم آ گیا۔ پیروں، مرشدوں کی اس اولاد کے آبا کی نیکیاں، دعائیں مدد کو لپکیں۔ اور انضمام کے عمل کی آخری تکمیلی چوتھائی کا اجلاس منعقد ہی نہ ہو سکا۔ پیٹی بورژوازی اور اپر مڈل کلاس نے انضمام سے قبل ہی کمیونسٹوں کو نکال باہر کر دیا، بغیر کسی وجہ کے، بغیر کسی قصور کے۔ اچانک انہوں نے شرط پیش کی کہ مسودے میں سے آئی ایم ایف اور عالمی مالیاتی اداروں کی تباہ کاریوں اور فیوڈل ازم کے خلاف باتیں نکال دی جائیں۔ انہیں پتہ تھا کہ ادغامی بیماری خواہ کتنی گہری کیوں نہ ہو، کمیونسٹ اپنے پروگرام کے ان نقاط سے دست بردار ہرگز نہ ہوں گے۔ اندازہ کر لیں کہ اگر خدانخواستہ انضمامی نشہ میں ٹُن دوست استقلالیوں کی یہ بات بھی مان جاتے تو ان کا سارا حسن، ساری وجاہت، ساری شان، سارا ماضی، ساری قربانیاں، کچھ بھی نہ بچتا۔ جیسے خوب صورت چکور کے بال اور پر اکھیڑ دیے جائیں۔ چنانچہ اتنے بڑے کمپرومائز کے لیے کوئی تیار نہ ہوا اور بغیر کسی بحث مباحثہ کے سرور کے کامریڈوں نے متفقہ طور پر اس شرط کو مسترد کر دیا۔ اور اپنے ہی خوب صورت نام سے اور خوب صورت منشور و آئین کے مطابق سیاست کرتے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ سرور بچ گیا، اس کی پارٹی بچ گئی، اس کے دوست، رفیق اور کامریڈ بچ گئے۔ اور اچانک بچ گئے جس کی اُمید تک نہ تھی۔

یہ ہوتی ہے کرامت، یہ ہوتی ہے بزرگی، اور یہ ہوتی ہے ولایت۔ دیکھئے محبوب سے وصال کی اُمنگ سرور صاحب کو اور کیا کیا پوشاک پہناتی رہے گی۔ کیا خبر کہ وہ تنظیمی ریخت سے بچنے کے لیے پاکستان سنڈے پارٹی کی محفل کی ایلفی استعمال کر رہا ہو!!۔

چنانچہ سرور، 27 دسمبر 2001ء کے بعد ہم دوستوں سے ''آغا'' کا لقب پا گیا۔ اس نے اپنے خاص چیلوں کو شکرانے کے بطور کالے بیل کی خیرات کا استخارہ سنایا۔ وہ کچھ عرصہ کے لیے بہت خوش تھا، مطمئن تھا اور اپنی پارٹی کے قافلے کے پرانے ساتھیوں کے ساتھ رواں دواں رہا۔ ساتھی، جنہیں ولیوں نے بچھڑنے سے بچایا، جنہیں آغا کے اجداد نے جگ ہنسائی سے بچایا۔ اب سرور کی پیروی ہم کم زور عقیدہ والوں پہ پکی ہوگئی ہے۔ وہ ہم گناہ گار فانی انسانوں کے سامنے ظاہری طور پر تو سرور ہی دکھائی دے گا مگر اپنے خاص خلیفوں اور مریدوں کو اصل درشن ''پہنچے ہوؤں'' والے لباس میں دے گا۔ یہ البتہ عجیب بات ہے کہ بشمول عبداللہ جان جمالدینی باقی جتنے لوگ انہیں ''آغا'' کہتے ہیں تو وہ پیروں والی شان دکھاتا ہے۔ مگر جب ڈاکٹر خدائیداد اسے آغا کہتا تو آغا شرما جاتا تھا۔

اس پیری فقیری میں اس کا خیال ہے کہ وہ پارٹی میں کارکنوں کی کمی بھی پوری کر پائے گا اور ہول ٹائمروں کا خرچہ بھی ''کچکول'' اور ''ٹگ'' سے پورا ہوگا۔ درجن بھر سال گزرنے کے باوجود ابھی تک بیعت کا باقاعدہ سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا خاص خلیفہ سابقہ فیصلے کے مطابق شیام کمار ہی رہے گا یا پھر دوستوں کے پرزور اصرار پر انسانی حقوق والوں اور وکیلوں کے امتزاج میں سے کسی کا انتخاب ہوتا ہے۔ (اس کا قندہار اور پشین کا پس ذہن منظر میں رہے)۔ بہرحال آغا زندہ باد، اس کی نیشنل ورکرز پارٹی زندہ باد، اس کا خلیفۂ خاص زندہ باد۔

مگر اُس کی پارٹی کو انضماموں کی جیسے بیماری لگ گئی ہو۔ محض ''مرجز'' نہیں بلکہ ''میگا مرجز'' بھی۔ اُس کی پارٹی جون بدلتی رہی، اتحاد کے نام پر نفاق کو اپنے حلق میں انڈیلتی رہی۔ جھنڈے، نام اور منشور بدلتی رہی۔ اور اب تو یہ بھی معلوم نہیں کہ صنم کی کمر کہاں ہے، کس طرح کی ہے، کدھر ہے۔

سی آر اسلم کی موت، اور پھر بقیہ حاوی لوگوں کی ''مرجریوں''، اور پھر، بلوچستان کے مخصوص سیاسی جنگی حالات نے ہر سیاسی ورکر کو اپنے سفر میں ذرا سا ٹھہراؤ لانے کا حکم دیا۔ تھوڑا ادھر اُدھر دیکھ لیا جائے۔ ازسرِ نو غور و فکر کیا جائے اور پھر کوئی سمت اختیار کی جائے۔ لہٰذا سرور ''آغا''

بلوچستان سنڈے پارٹی میں ہے،سنگت اکیڈمی میں ہے۔

سرور کے گھر میں دوستوں کی مہمان داری اور بہنوں جیسا پیار دینے والی اُس کی بیگم ہے۔ ہماری دو بھتیجیاں ہیں وہاں' فریدہ اور عزیزہ۔ دونوں ماسٹرز کی ڈگری لے کر (ایک بیٹی تو سرور کی بہت محنت اور شخصی تکالیف و ارادے کے باعث پی ایچ ڈی کر چکی ہے)۔ اپنا اپنا گھر بسا چکی ہیں۔ اولاد والیاں ہیں۔ خدا انہیں سُکھی رکھے۔

سرور کا اکلوتا بیٹا محمد اکرم ہے جو بالآخر میٹرک میں پاس ہو ہی گیا۔ وہ بھی باپ کی طرح ہر لفظ پر توتلوں جیسا فل سٹاپ لگاتا ہے۔ بولتے ہوئے باپ بیٹا دونوں ہر لفظ کو گردن سے پکڑتے ہیں اور جب تک لفظ اَدھ موانہ ہو آگے نہیں بڑھتے، جیسے چلتن ایکسپریس کا انجن ہر سٹیشن پر فیل ہو جاتا ہے۔ اکرم، سرور صاحب کے طفیل نوکری حاصل کر چکا ہے۔

سرور ایک مخلص اور اچھا دوست ہے۔ وہ اپنے بے شمار دوستوں میں سے ڈاکٹر معصوم کاسی اور جعفر اچکزئی مرحوم سے قہقہوں کا اپنا حصہ وصول کرتا رہا ہے۔ سیف الدین بوہرہ' ہدایتو اور چاچا عبدالحق سے عرشی فلسفہ بازیاں کرتا رہا ہے' شیام کمار سے لفظ ونطق کی بے انت موشگافیوں میں اُلجھا رہا ہے۔ ڈاکٹر امیر الدین سے دوستی کا گلی ڈنڈا کھیلتا رہا ہے۔ ڈاکٹر خدائیداد کے طویل کمٹمنٹ کے ٹھنڈے حوض سے پیاس مٹاتا رہا ہے اور ماما عبداللہ جان کا پرستار ہونا تو خیر ہم سب کی تقدیروں میں لکھا گیا ہے۔

انوراحسن صدیقی

(1940......20 جولائی 2012)

بلوچستان کے ماما عبداللہ جان کے دوستوں میں سے کراچی (دراصل یو پی) کے صدیقی صاحب اُن کے بہت ہی قریبی دوست تھے۔ یہ دوستی اُس وقت شروع ہوئی جب 70ء کی دَہائی میں کراچی میں روسی کونسل خانے سے ''طلوع'' نامی رسالے کا اجرا ہوا تھا۔ اور یہ دونوں اس میں کام کرتے تھے۔

صدیقی صاحب مفصل تقریر کرتے تھے، تحریر میں بھی وہ ایک ہی گیئر سے کام چلاتے تھے۔ بسیار نویس وطوالت نویس مگر علم اور بالخصوص مارکسی علم میں اُسی طرح زبردست تھے جس طرح کہ مارکسزم کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ میں تھے۔ مجال ہے کہ انہوں نے کہیں سیکرٹری گیری یا جنرل سیکرٹری گیری کے لیے کسی کو کہنی مار کر پیچھے دھکیلا ہو۔ ایک بہت ہی منظّم انسان جو دوستی کرنا بھی جانتا تھا اور وفا کرنا بھی۔ لکھتے چلے جاتا تھا، ترقی پسندی پھیلاتا چلا جاتا تھا۔

وہ اپنی سوچ ونظریہ کے پکے مستقل مزاج اور پیہم وفادار تھے۔ ایک بہت ہی روشن فکر خیال کے مالک، مگر الگ تھلگ۔ اس کو ہندوستان آنے جانے کے لیے نظریہ بیچنے کی ضرورت کبھی نہ پڑی۔ وہ وہاں کے کسی ادیب وشاعر کو یہاں بلوا کر اجرک والی رواج یافتہ حرکت کے کبھی مرتکب نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''اجرکی ادیبوں'' میں گھل مل نہ سکے۔ نور محمد شیخ اور صدیقی صاحب کبھی

''ہوائی'' لوگ نہ رہے۔اسی لیے خود اپنی ایک دنیا بسائے رہے۔اس بات سے بے پرواہ کہ کون، کدھر، کیا کر رہا ہے۔اُن کے لیے ادب میں پاکیزگی زندگی میں پاکیزگی کی طرح مقدم و مقدس تھی۔کمٹ منٹ اور انوار احسن صدیقی دونوں ایک ہی نام تھے۔میر گل خان نصیر اور میر عبداللہ جان کے ذاتی و فکری دوست تھے۔اس لیے ہمارے بزرگ تھے۔

خلیق اتنے کہ حیرت ہوتی تھی۔ایک فون کرو تو دس دس بار اُس کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ ایک آدھ کتاب یا رسالہ بھیجو تو جیسے سمرقند بخش دیا ہو۔احسان مند، عاجز، پکے، کھرے۔

صدیقی صاحب کہانیاں لکھتے تھے۔شیطان کی آنت جتنی لمبی کہانیاں (شیطان کی آنت کی طوالت کا خیال پتہ نہیں پہلے کس کو آیا تھا!)۔اُن کی کہانیوں کو short stories نہیں بلکہ ناولٹ کہنا چاہیے۔اسی طرح انہوں نے بے شمار ناول لکھے۔انوار احسن صدیقی کی تحریر بالکل پڑھی نہ جاسکتی تھی۔اس قدر باریک لکھنے کے عادی تھے کہ منتیں سماجتیں سب بے کار۔الٹا فخریہ کہتے تھے کہ وہ چاول کے دانے پر ایک دو مصرعوں کا پورا شعر لکھ سکتے ہیں..........بغیر مائیکروسکوپ کے۔ اتنا چھوٹا لکھتے تھے کہ عدسہ لگا کر ہی پڑھا جاسکتا تھا۔وہ ماہنامہ 'سنگت' میں ''باتیں ارسلان کی'' کے عنوان سے مستقل لکھتے رہے۔عام سماجی سیاسی موضوعات جنہیں وہ عام فہم بنا کر لکھتے تھے۔اسی طرح اپریل 1999ء 'سنگت' میں ان کا مضمون ''عصرِ حاضر اور مارکسی صداقت'' چھپا۔اسی شمارے میں ''حمزہ کی یاد میں'' پر بھی ان کا مضمون چھپا تھا۔''عصر حاضر اور مارکسی صداقت'' کے عنوان سے مئی 1999ء میں بھی ایک مضمون چھپا۔مئی 1999ء میں بھی ''حمزہ کی یاد میں'' نامی ان کا ایک مضمون چھپا۔جون 99ء میں بھی۔اسی طرح ''عصر حاضر اور مارکسی صداقت'' جون 99ء میں بھی چھپا۔''حمزہ کی یاد میں'' جولائی 99ء ''باتیں ارسلان کی'' اگست 99ء، نومبر 99ء صدیقی صاحب نے جولائی 2002ء کے 'سنگت' میں دو اہم مضامین لکھے: ایک ''سائیں عزیز اللہ'' کی زندگی اور خدمات کے بارے میں اور دوسرا ''دہشت گردوں کے حوصلے''۔اگلے ماہ اگست 2002ء میں ان کے سبق آموز مضمون کا عنوان تھا: ''زاہدہ کی کہانی''۔ہمارے بزرگوں میں وہ واحد عجیب و غریب دوست تھا جو باقاعدہ ڈائجسٹوں میں لکھا کرتا تھا۔اس کے آٹھ ناول چھپ چکے ہیں۔عبدالستار

ایدھی پہ اس نے ایک کتاب لکھی۔اسی طرح ''ایک خبر ایک کہانی'' کے عنوان سے اس کا افسانوی مجموعہ موجود ہے۔صدیقی صاحب نے بے شمار ترجمے کیے۔

اپنی شاعری کو اس نے خود کبھی زیادہ لفٹ نہ کرائی۔انہوں نے مصنفی برائے مصنفی نہ کی۔اس کے سامنے ایک کاز، ایک مشن اور ایک عزم تھا۔وہ مظلوموں، مقہوروں کو شعور دینا چاہتا تھا۔اور اس معاملے میں وہ نہ تو کبھی تھکا، نہ ہارا اور نہ شکست کھائی۔

قلم کاغذ سے اس کا تعلق طالب علمی سے تھا، جب وہ ''این ایس ایف'' کی طرف سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''لوح و قلم'' نکالا کرتا تھا۔اسی ''این ایس ایف'' کے جرم میں ایوبی مارشل لا نے اسے کراچی بدر کر دیا تھا۔

انوار احسن صدیقی بلوچوں سے خصوصی رغبت رکھتا تھا۔میر غوث بخش بزنجو کی بہت عزت کرتا تھا۔میر گل خان نصیر سے اُس کی اچھی دوستی رہی۔خود مجھ سے استاد شاگردی والا مہربان لگاؤ رکھا۔

صدیقی صاحب کافی عرصے سے روزنامہ 'ایکسپریس' میں لکھتا تھا۔ایک سخت زمانے میں سخت زندگی گزار کر صدیقی صاحب ایک سخت و طویل مرض کی سختیاں جھیل جھیل کر ہم میں سے اٹھ گیا۔72 سال کی عمر میں وہ انتقال کر گیا۔اس نایاب نسل کا نایاب فرد۔وہ اُس ساری نسل کا نمائندہ تھا جنہوں نے موجودہ نسل کو علم و عقل دی، سوچنے فکر کرنے کی عادت ڈالی اور نظم و ڈسپلن اپنایا' ذاتی زندگی میں بھی اور سماجی سیاسی تنظیم میں بھی۔اسے یاد نہ رکھنا خود کو فراموش کرنے کے مترادف ہے اور خود فراموشی تو بہت بڑا عیب ہوتی ہے۔

متحرک ورکر

سائمن غلام قادر

میں ان آنکھوں کے صدقے جاؤں جنہوں نے وہ ڈراؤنی آنکھیں نہیں دیکھیں جو ضیاالحق نے ہر دیوار کی ہر اینٹ میں ڈال رکھی تھیں اور جنہوں نے سائمن غلام قادر کا وہ انداز نہ دیکھا جو رات کو چار چار بجے انہی دیواروں پر ''مارشل لا مردہ باد'' اور ''دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ'' کے نعرے لکھنے میں رنگ کا ڈبہ پکڑے یا برش کاری کرتے ہوئے میرے ساتھ ساتھ ہوتا۔ لمحہ بہ لمحہ گزرتی پولیس کی پارٹیاں دھر نہ سکیں تو یہ ان کی نا اہلی تھی، ہم لوگوں نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ڈاکٹر خدائیداد اُسے ''سائمن کمیشن'' کہتا تھا حالاں کہ وہ صرف سائمن کا نٹ تھا یا زیادہ سے زیادہ والد کی نسبت سے سائمن غلام قادر۔

مجھے کچھ یاد نہیں وہ کیسے ہم سے آن ملا، یا اُسے ہمارے بارے میں کس نے بتایا تھا۔ شدید جدوجہد کے دور میں لوگ کاروان میں شامل ہو ہی جاتے ہیں، درخواستیں دینے یا فارم بھرنے 'یا پہلے مشاہدہ میں رکھنے کے بعد پکا ممبر بننے جیسے کوئی پاپڑ بیلنے نہیں پڑتے۔ اور نہ انہیں اپنے میں شامل کرنے کے لیے بہت تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ سو' ہم اور سائمن بس گرم لڑائی میں باہم ملے۔ چونچلے بازی اور چیخنے والی بحثوں کا وقت کہاں تھا۔ ضیا تھا، مارشل لا تھا، سختیاں تھیں، پکڑ دھکڑ تھی اور اُدھر سے دفاعِ افغان انقلاب تھا۔ مزدور ہڑتالیں' ٹرانسپورٹ ہڑتالیں، شٹر ڈاؤن ہڑتالیں......اس عروج میں ہم اکھٹے ہوئے۔

ہفتہ وار سٹڈی سرکلوں کا اندازہ کیجیے۔ خدائیداد کے ہاں' سول ہسپتال میں، ریلوے میں، ڈاک خانہ میں، بی ایم سی کے ہاسٹل میں، ڈگری کالج میں، بلوچستان یونیورسٹی میں، مشن ہسپتال میں، بستی پنچائیت میں، الفلاح میں، جم خانہ میں اور اگر قید خانہ ہو تو جیل میں۔ پھر پارٹی کی شاخیں ژوب میں، سبی میں، ماوند میں، پشین میں......

یہ سارے کام کرنے کے تھے۔ اچھی خاصی یونینیں ہمارے ساتھ تھیں: ریلوے کی، میونسپل کارپوریشن کی۔ باقی یونینوں میں شدید انداز میں ہماری اثر اندازی بڑھتی جا رہی تھی۔ طلبا میں سوشلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن زبردست طور پر پھیلتی پھولتی جا رہی تھی۔ بلوچستان کی دیگر ترقی پسند تنظیموں سے مل کر پروگریسو سٹوڈنٹس الائنس بن چکا تھا، وکلا برادری میں لوگ پیدا ہو رہے تھے، ڈاکٹروں میں تو اچھا بھلا اثر و رسوخ رکھنے والا درمیانے طبقے پر مشتمل گروہ جنم لے چکا تھا۔

الغرض ہر لحاظ سے پہلو دار ہلچل کرنا پڑ رہی تھی۔ سائمن پھِرکی کی طرح اول صف کے احباب میں شامل تھا۔ ہمیں گھسیٹ کر کبھی وہ چرچ میں داخل کر رہا تھا، کبھی باڈی بلڈنگ والے بکھرے ہوئے اوزاروں سے بھرے کمرے میں خفیہ میٹنگ منعقد کروا رہا تھا، کبھی اپنی والدہ کے ہاتھوں پکی روٹیاں کھلوا رہا تھا۔ کبھی الفلاح سکول کے بچوں کے ساتھ کیرم کھلوا رہا تھا۔ اور کبھی خاکروبوں کو اسٹڈی سرکل دلوا رہا تھا۔ میں اس کے ہاتھوں کھلونا بن چکا تھا۔

الفلاح اُس کا اولین اڈہ تھا۔ یہاں اس کا استاد نما' زبردست دوست فادر آٹو رہتا تھا۔ یہ دونوں کیتھولک چرچ کی چیرہ دستیوں کے انتہائی مخالف تھے۔ بالخصوص چرچ میں موجود اپنے مذہبی ادارے میں سسٹروں (Nuns) کی بدترین غلامی کے خلاف تھے۔ سائمن کے خیال میں یہ عورتیں مذہب کے نام پر بدترین پابندیوں کا شکار ہیں۔ ایک احاطے میں بند ساری عمر سکول ٹیچروں یا نرسوں کی حیثیت سے کام کرتی ہیں مگر انہیں ایک ٹکہ تک معاوضہ نہیں ملتا۔ ان پر یونیفارم پہننے کی پابندی تقریباً 24 گھنٹے رہتی ہے۔ کوئی چھٹی رخصت نہیں، کوئی تفریح آؤٹنگ نہیں۔ یہ خواتین مذہبی رہنما ہوتے ہوئے بھی، اپنی ساری عمریں وقف کیے ہوئے بھی' کبھی فادر نہیں بن سکتیں، کبھی کارڈینل اور پوپ نہیں بن سکتیں۔ بدترین صنفی امتیاز کا شکار ہے چرچ۔

سائمن اور فادر آٹو' لبریشن تھیالوجی نامی فلسفے سے متاثر تھے۔ آٹو کو موسیقی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ بہترین کتابیں اس کے پاس تھیں۔ وہ شہر بھر سے سکولی عمر کے بچوں کو اپنے پاس ہاسٹل میں رکھتا اور تعلیم دلاتا۔ اس کے سکول نے بہترین انسان پیدا کیے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ماسٹر صدیق یہیں متعین تھا جو سائمن کا بڑا بھائی تھا۔ ہمارا آنا جانا ہوا، ہم نے یہاں کئی دوست اور کئی ہم خیال بنائے۔ انہیں مارکسزم پڑھائی اور ان کی تربیت میں اچھا خاصا کام کیا۔

سائمن کا دوسرا بڑا اڈہ (اُس کا اصلی اڈہ تو میرا دل تھا) بستی پنچائیت کوئٹہ تھا، جہاں اس کے والدین رہتے تھے۔ اس نے وہاں اچھا خاصا گروپ بنایا۔ خاکروبوں کی اس بستی میں بڑی تعداد میں، اور اچھے نظریاتی ساتھی پیدا کیے۔ سائمن کی ہمت اور لگن سے ہم نے یہاں خاکروبوں کی یونین قائم کی، اسے رجسٹر کروایا اور پھر الیکشنوں میں بھرپور کام کیا۔ ضیاالحقی لوگوں کو شکست فاش دی اور ان کی دائمی مخالفت مول لی۔ ہم نے یہاں روایتی چودھریوں اور انتظامیہ کے ٹاؤٹ لیڈروں کی ناک میں دم کیے رکھا۔ سائمن نے بستی میں سے ہر قسم کی سماجی برائی کا خاتمہ کرنے کے لیے دن رات کام کیا۔ بدترین حالات میں کام کرنے والے محنت کش انتہائی گھٹیا شراب کے نشے میں دھت ہوا کرتے، اپنی بیویوں کو پیٹتے اور دیگر سماجی برائیوں کی راہ ہموار کرتے۔ سائمن نے ڈٹ کر ان سب کا مقابلہ کیا۔

یہی سارا کام اس نے چمن پھاٹک کوئٹہ میں قائم جیم خانہ میں بھی سرانجام دیا۔ مجھے اَن گنت سٹڈی سرکل یاد ہیں جن میں ہم انہی سماجی برائیوں کے خلاف بات کرتے کرتے مارکسزم تک پہنچایا کرتے۔ جم خانہ نے پارٹی کو بہت اچھے نوجوان ورکر اور دانش ور عطا کیے اور یہ سب سائمن کی شب و روز کی محنت کا نتیجہ تھا۔

سائمن نے ہسپتالوں میں کام کرنے والے مرد اور خواتین نرسوں میں بھی پارٹی کا کام جاری رکھا اور وہاں سے اچھے کامریڈ بنائے۔

ان علاقوں میں پارٹی کے اخبار کی تقسیم بھی خوب کی۔ وہ اس میں خود بھی لکھتا تھا۔''

اقلیت اندھیروں میں ہے''اس کی انہی دنوں کی بہت اچھی تحریر ہے۔

سائمن غلام قادر کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ اس نے بائبل کی تعلیمات کے بارے میں ہم غیر مسیحی کامریڈوں کی معلومات میں بہت اضافہ کیا۔ ٹیسا بالاسوریا اس کا پسندیدہ مصنف تھا۔ اُس نے ہمیں چرچ کے خلاف بغاوت کرنے والے اِس بڑے انسان کی کئی کتابیں پڑھوائیں۔ سائمن ہی نے ہمیں فادر یوسف گِل سے ملوایا جو بہت اچھا روشن فکر فادر تھا۔ وہ یہاں کوئٹہ سے ایک ادبی رسالہ ''بوئے مادران'' نکالتا تھا۔ اور اس نے بعد میں چرچ کی زنجیریں توڑ کر آزادانہ زندگی اپنالی۔ سائمن ہی کے ذریعے ہم ممتاز شاعرہ سسٹر شبینہ سے واقف اور بعد میں ان کے مرید بنے۔ یہ محترم خاتون بہت قلیل عرصے میں ایک نام ور شاعرہ کے بطور ترقی کر گئی اور ایک بہترین افسانہ نگار ہوئی۔

ایک لکھاری اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سائمن کو میوزک سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ایک زود دوست قسم کا انسان تھا۔ منٹوں میں دوستی گانٹھ لیتا تھا۔ کوئٹہ شہر کے تمام ٹریڈ یونینسٹ، طالب علم رہنما، اور سیاسی لیڈر اس سیماب صفت شخص کو جانتے تھے۔ ایک خوب صورت سماجی ورکر تھا وہ۔ کسی کی فیس معاف کروا رہا ہے، کسی نادار کے لیے نصابی کتابیں خرید وا رہا ہے اور کسی کو روٹی روزگار کے حصول میں مدد دے رہا ہے۔ 1985ء میں جب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور گیا تو سائمن سے کچھ عرصہ کے لیے رابطہ کٹ گیا۔ اسے کراچی جانا پڑا اور وہیں سے اس کی سرگرمیوں کی خبریں آتی رہیں۔

مگر' وہاں اُس بڑے شہر میں ہمارا دوست ہلکان ہو گیا۔ وہاں لیفٹ کی مکروہ روایتی گروہ بندی' کا نا پھوسی بہت تھی۔ ایک سادہ، جانا پہچانا اور نسبتاً سچے پس منظر والا کوئٹہ کا سائمن ایک انجانے ، بہت بڑے اور گنجلک شہر میں اپنی محنتوں کا ثمرہ بٹورنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ دل برداشتہ تو نہ ہوا مگر اس کی دھار میں کندی ضرور آئی۔ تحریک کے اندر کی تفرقہ بازی نے اس کی رفتار پہ بہت برا اثر ڈالا۔

جب وہ کوئٹہ آیا تو سیاست کے بجائے سماجی خدمت کی طرف زیادہ متوجہ ہوا۔ ایک این

جی او بنائی۔ کچھ پیسے کہیں سے ملے۔ ایک آدھ کمپیوٹر حاصل کیا، ایک سوزوکی وین لی اور اقلیتوں کی ایک انتہائی گری ہوئی برادری یعنی لچھیوں کی بستی میں سماجی خدمات شروع کیں۔ وہ ان کے لیے لیٹرین قائم کرنے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اس زمانے میں سیاست پر کم بات کرتا تھا۔ وہ مجھے سیاست میں استاد کہتا تھا مگر سیاست کے بجائے اب وہ اپنے سماجی کاموں کی رپورٹ بہت تفصیل اور فخر سے بیان کرنے لگا تھا۔ کراچی کی لنگڑی گروہ بندی اسے ہم سے کچھ دور کر گئی تھی۔ چنانچہ ہم اچھے دوست رہتے ہوئے بھی دوبارہ اس مقام تک نہ آسکے جو ہم نے قبل از کراچی حاصل کر رکھا تھا۔ وہ دسیوں بار مجھے اس بستی میں لے جانے کا کہہ کر بھی نہ لے جاسکا۔ ہم درجنوں بار پھر سرگرم ہونے پر متفق ہو کر بھی سرگرم نہ ہو سکے۔ ہماری دوستی جاری رہی اور ایک دن پتہ چلا کہ بڑے خلوص اور ایمان داری کے باوجود وہ اپنا کام مکمل نہ کر سکا اور ایک بار پھر اسی جہنم نما شہر چلا گیا۔

وہاں سے کبھی کبھی اس کے سلام پیام ملتے رہے۔ کبھی ماہنامہ جفاکش، کبھی لیبر پارٹی، کبھی عوامی جمہوری پارٹی...... پتہ نہیں نا خالص خوراک میں اُسے کیا کیا الا بلا ملتا رہا۔ ایک بار جب کراچی جانا ہوا تو وہاں اس نے رکشوں پر بٹھا کر پورا شہر گھمایا اور جگہ جگہ اپنے دوستوں سے ملوایا۔ دو دن تک ہم یہی کام کرتے رہے۔ امانویل والے کتاب گھر، انقلابی شاعر بینجمن، جفاکش میں اس کے ساتھی۔ ہم پھر سے 1970ء کی دَہائی میں داخل ہو چکے تھے۔

وہ پھر کوئٹہ آیا۔ اب کے وہ مزید سنجیدگی سے زندگانی کے زیروبم میں شامل ہوا۔ ایک سال میں پتہ نہیں کتنے دوستوں سے ملوایا، مباحث منعقد کروائے، اپنے نوجوان بیٹے سے ملایا۔ اپنی بیگم سے ملوایا...... اور اپنی اتاہ تنگ دستی سے ملاقات کروائی۔ ٹیوشنیں اور انقلاب کا چھلکتا موجیں مارتا جوش۔ سائمن مجھے دو گھڑی میں سرگرم کارکن بنانے میں کامیاب ہو جاتا اور ہم پھر تیس برس قبل والے نوجوان انقلابی بن جاتے۔ ہم نے پھر سے منصوبے بنائے۔ اسی عزم کے ساتھ کمریں کس لیں۔ میں امیرالدین اور خدائیداد کی موت کے ہاتھوں شدید ترین تنہائی کے احساس سے کچھ کچھ باہر آنے لگا۔ ''سنگت'' رسالہ کو بہتر بنانے کی باتیں ہوئیں، چرچ کے فیوڈل حاکموں سے بھڑ جانے کے راستے سوچے گئے، خاکروبوں کی یونین کو پھر سے انسان بنانے کی تراکیب سوچی گئیں......

مگر ایک بار پھر یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ اس بار سائمن اپنی فریم شدہ تصویر کے نیچے ایک موم بتی جلوا کر ہمیں پھر چرچ بلوایا۔ اب کے اس کی میموریل سروس تھی۔ ہم نے اس کی تصویر پہ جلائی گئی موم بتی کو بجھنے نہ دینے کا عزم کیا' کشید در کشید کیے ہوئے دوشفاف آنسوؤں کا جام اس کی تصویر پر اچھال دیا۔ اور کچھ کہے بغیر' بہت کچھ سہہ کر واپس آ گئے۔

بحث کا عادی

اکرام احمد

وہ بہت مزے لے لے کر بحثیں کرتا تھا۔ بحث کر کر کے، دلیلیں دے دے کر، بالآخر ہم کسی ایک بات پر متفق ہو جاتے۔لیکن یہ اتفاق اس انداز میں دلچسپ تھا کہ ہم متفق تو ہو جاتے مگر اگلے دن وہ پھر اسی بات کو موضوعِ بحث بناتا۔ہم پھر وہیں سے شروع کرتے اور پھر اُسی نتیجے پر پہنچ جاتے جس پر گذشتہ روز پہنچے تھے۔میں نے بحث کے لیے اکرام احمد جیسا مشاق شخص کبھی نہ دیکھا۔ وہ ''From the core of his heart'' بحث کرتا تھا۔

چوں کہ اُسے بحث ومباحثے سے فرصت نہ تھی تو بھلا وہ فعال سیاست کیا کر پاتا۔ویسے بھی اخبارنویس (یا پھر وکیل) سے زیادہ ''بحثُو'' کوئی اور کون ہوگا۔

تب ہم سوشلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے نام سے کام کرتے تھے ۔اکرام سائنس کالج کوئٹہ کا یونٹ سنبھالتا تھا۔وہ اردو بہت خوب صورت بولتا تھا مگر لہجہ ''الف مدآ'' کی طرح ہمیشہ اکڑا ہوا ہوتا۔چھوٹا قد، گورا رنگ، بال پیچھے کی طرف کنگھی کرتا تھا۔اس کا ایک اضافی دانت تھا جس کو بلوچی میں ''ششو'' کہتے ہیں۔

بلا کا ذہین نوجوان، مگر اس کی کج بحثی سے ہم تنگ آچکے تھے۔تین تین گھنٹے تک چینکی چائے کے پیالے پر موسلا دھار بحث کیا کرتے تھے ۔بحث کے اس پورے عرصے میں ہم نے

سوشلزم کا گراف ہفت آسمان تک جاتے بھی دیکھا اور دھڑام سے گہرے کھڈ میں گرتے بھی سنا۔لہٰذا قدرتی امر ہے کہ ہماری طبیعتیں بھی اسی گراف کی محتاج رہتیں ۔ایک دوسرے پہ فقرے بازیاں کرنے آتے تو سننے والے پاگل کا خطاب دینے میں حق بجانب ہوتے اور غم طاری ہو جائے تو گھنٹوں بیٹھتے مگر واحد فقرہ تک نہ نکلتا۔آپ تصور کر سکتے ہیں کہ خاموشی کے یہ وقفے اکرام پر کس قدر گراں گزرتے ہوں گے۔

اکرام فلسفہ اور معاشیات مجبوراً پڑھتا تھا۔وہ شوقین پڑھاکُو نہ تھا۔پڑھنے کی اس کی رفتار بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔سٹڈی سرکلوں کے علاوہ اگر کتاب لے جاتا تو مہینوں لگاتا۔ہم اُس زمانے میں عوامی جمہوریت، سی آر اسلم کی تصانیف اور فلسفہ کے دیگر اساتذہ کی کتابیں ہی پڑھا کرتے۔

ہم لوگوں کے لیے 1978ء کا افغان انقلاب جہاں نعمتِ خداوندی بن کر آیا تھا، وہاں اپنے ساتھ چیلنجوں کا ایک بارِ شتر بھی لایا۔ بلاشبہ افغان انقلاب خود زندہ نہ رہا مگر قیامت میں بھی وہ گواہی دے گا کہ اس کے ساتھ اکرام اور اس کے دوستوں نے بعد از مرگ بھی وفا جاری رکھی ۔ بلاشبہ سوویت یونین بھی زندہ نہ رہا مگر وہ بھی روزِ محشر بلند آواز میں کہے گا کہ ''اس گروہ نے بنا حرص و غایت میری پذیرائی آخری دم تک جاری رکھی''۔

اس کی تعلیم ختم ہوئی ، ہم اپنی ملازمت کے سلسلے میں کوئٹہ سے دور چلے گئے ۔ یوں ملاقاتوں، سرگرمیوں اور بحثوں کے سلسلے بکھر گئے اور پھر اُس وقت بحال ہوئے جب اکرام روزنامہ 'جنگ' میں چیف ایڈیٹر کا نمبر دو بن گیا۔اب کے اخبار والوں سے یاری لگانے کے عادی' ہمارے محبوب دوست امیر الدین کے ساتھ اُس کی دوستی زیادہ پکی ہوگئی۔ وہی اُس کے دفتر جاتا تھا، بحثیں دعوتیں کرتا تھا۔مگر ہماری رفاقت چوں کہ بہت پرانی تھی اس لیے ٹیلی فون پر تقریباً ہر ہفتہ ملاقات رہتی۔اکرام کا ٹیلی فون محض ملاقات نہ رہتا۔وہ تو ڈیڑھ گھنٹہ طویل فون کیا کرتا تھا۔ایک بات شروع کرتا تو اسے کولپور تک پہنچا کر دوسری بات کر پاتا۔

پھر وہ بیمار ہو گیا۔اس کے خون میں ہیموگلوبن کم ہونے لگی۔وہ میری لیب آتا، خون میں ہموگلوبن کی مقدار چیک کرواتا۔اُس کی ہتھیلیاں سرخ ہو جاتی تھیں۔ ہاتھوں میں تکلیف تھی۔ پھر

وہ کراچی گیا، آیا، گیا اور ''مار دینے والی بیماری'' کی تشخیص لے کر واپس ہوا۔ اور فوت ہو گیا۔
مگر موت کیا سمجھتی ہے، ہم اپنے ساتھیوں کو یاد نہ رکھیں گے کیا؟۔

سنجیدہ انقلابی

ڈاکٹر سعید مستوئی

سعید مستوئی کے خاندانی پس منظر سے میں بہت عرصہ بے خبر رہا۔ اس کی مجھے کوئی خاص تلاش بھی نہ تھی۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھاگ نامی علاقے میں پیدا ہوا تھا)۔ بس اتنا ہے کہ وہ اُن فارغ التحصیل شاگردوں میں سے ایک تھا جو اپنے استادوں کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے۔ ممکن ہے یہ جیکب آباد کالج والے اساتذہ کا کمال تھا۔ لیکن اگر اُن میں کوئی کمال ہوتا تو سعید سگریٹ پیتا ہی کیوں؟! میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ اچانک اپنے کسی استاد کو دیکھ کر وہ اپنا جلا ہوا سگریٹ تیزی سے پشت کی جانب لے جا کر وہیں اپنی انگلیوں سے بجھا دیتا تھا۔ یہ فیوڈل کروفر ہے یا مشرق کی اخلاقیات! تکریم واحترام بہرحال اچھی اقدار ہیں۔ کچھ یاد نہیں کہ سعید مستوئی کیسا سٹوڈنٹ تھا۔ اس لیے کہ وہ بڑھ چڑھ کر آگے آنے اور زبردستی استاد کی توجہ حاصل کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ رویوں کی رفتار کو، وقتی مصلحتوں کے تحت اَدل بدل کر دینے میں، استقامت کی موت ہوتی ہے۔ سعید مر گیا مگر استقامت کو موت نہ آنے دی، ادب وآداب میں بھی، سیاست ونظریات میں بھی۔

سعید مستوئی طالب علمی کے زمانے میں ترقی پسند سیاست سے وابستہ ہوا۔ ایک عمومی جذباتی فضائی موجودگی کے باجود استدلال اور منطق بھری سوچ پہ ڈٹا رہا۔

برصغیر میں ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ نظریاتی یک جہتی نے بار بار استاد شاگرد کے بیچ احترام ومحبت کی دیوار پگھلا دی۔ کئی بار ہم نے پسماندہ سماج جیسی فوری بے تکلفی کو بے ہودگی میں

بدلتے دیکھا۔ مگر سعید ایسا نہ تھا۔ وہ پہلے استاد کو استاد مانتا تھا اور پھر کہیں جا کر نظریاتی اتفاق ،اختلاف تلاشتا۔

نظریات اور شخصیات دو دھاری تلواریں ہوتی ہیں ۔ یہ متحد رکھنے والی قوت بھی ہوتی ہیں اور فرقہ واریت میں مبتلا کر دینے والی کلہاڑی بھی ۔ مجھے یاد ہے کہ کمیونسٹ سعید کو اس کا کمیونزم (نظریہ) بہت سے دوسرے کمیونسٹوں سے ملنے نہیں دے رہا تھا۔ ایک بدترین فرقہ بازی تھی لوگوں کے بیچ۔ تاریخ کا مذاق دیکھئے کہ بلوچستان میں اُس وقت فرقوں میں بٹے کمیونسٹوں کو "دنیا بھر کے مزدورو ایک ہوجاؤ" والا نظریہ نہیں بلکہ ایک شخصیت باہم قریب لائی ۔ اُس بڑی شخصیت کا نام تھا: میر غوث بخش بزنجو۔ وہ بھی اپنی زندگی میں انہیں قریب لانے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ بلکہ بزنجو صاحب کی وفات کے بعد اسے یاد رکھتے رہنے کا عزم اِن باہم دست و گریباں لوگوں کو یک جا رکھنے کا موجب بنا۔ بزنجو فاؤنڈیشن، پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن اور لوز چیذغ کی طویل راہوں میں چلتے نکھرتے سعید مستوئی نے بالآخر نہ صرف سنگت اکیڈمی آف سائنسز بنالی بلکہ وہ اس کے بہت ہی ثابت قدم منتظمین میں سے ایک بنا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ یہ عام مستقل مزاجی نہ تھی۔ بیسویں اکیسویں صدی کے سنگم کا عہد، انسانیت کی عمومی شکست کا عہد ہے۔ اس میں حق اور محنت کی بالادستی کا پرچم بلند کیے رکھنا ایک معنی رکھتا ہے۔ ساری انسانی استقامت کی تاریخ ایک طرف رکھئے، یہ بیس سال کی مستقل مزاج کمٹ منٹ اس پہ بھاری ثابت ہوگی۔

سوشلزم کو ایسی بڑی پسپائی کبھی دیکھنی نہ پڑی تھی۔ ایک پورا عہد دھڑام سے گر گیا......
قول کا عہد، اعتبار کا عہد، ہمدردی کا عہد، سرفروشی کا عہد، ایثار کا عہد، دور بینی کا عہد، انٹرنیشنلزم کا عہد، انسانیت کا عہد۔ اور ایک دوسرا عہد شروع ہوا...... سرمایہ پرستی کا، خود غرضی خود پرستی خودنمائی کا، افراتفری کا، انارکی کا، پٹرو کلچر کا، کشت و خون کا، لوٹ مار کا، بے گانگی کا اور تنہائی کا عہد۔ ایسی نفسا نفسی کے عہد میں کابل و کینیا کے ناتواں انسان کے بارے میں سوچنے والا غیر معمولی انسان ہوتا ہے۔ جو سعید اِن دو دہائیوں میں لرزش سے پاک استقامت کے ساتھ اپنے نظریے سے چمٹا رہا، وہ بہت ہی بڑا امردِ سعید نکلا۔ سنگت سعید ایک غیر معمولی انسان تھا۔ وہ اپنے عہد کا بابو شورش تھا۔

ڈاکٹر سعید مستوئی لکھتا بھی تھا۔ قبائل میں بٹے ہوئے لوگوں کو ایک غیر قبائلی سیاسی شخص بھلا اور کس طرح مخاطب کر پائے گا۔ خصوصاً جب جلسہ، جلوس، سیمینار، اور کنونشن کا رواج ختم ہو چکا ہو۔ سعید مضامین لکھتا، چھپنے کے لیے بھی اور (چند) دوستوں کو سنانے کے لیے بھی............ مارکسزم کے مرکزی نکتے کے گرد بُنے ہوئے یہ مضامین بہت واضح ہوتے، کوئی نظریاتی جھول نہیں، کسی طرح کی مصنوعیت نہیں۔ کچھ کچھ ادبی چاشنی رکھنے والے اِن مضامین نے ڈھلمل درمیانہ طبقے کو ہمیشہ استقامت کی راہ دکھائی۔

سعید ترجمے بھی کرتا تھا۔ زیادہ تر سندھی سے۔ اِس معاملے میں بھی اُس کے انتخاب کا ایک ہی گز ایک ہی معیار ہوا کرتا تھا: مارکسزم۔

اس نے شاعری بھی کی۔ مگر قافیہ و ردیف کے مارے ہوؤں کو یہ شاعری کچھ زیادہ اپیل نہیں کرتی۔ البتہ وہ کہیں کہیں ایک آدھ مصرع ایسا لکھ جاتا جو توجہ بڑی شدت کے ساتھ اپنی طرف مبذول کراتا ہے۔ لگتا ہے طویل عمر کی دعا نہ دینے والے بخیل پیر نے اچھی شاعری کی دُعا میں بھی بڑا دل نہ دکھایا۔

سنگت سعید مستوئی، سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے ساتھ وابستہ رہا۔ اور بلوچستان کے اس تھنک ٹینک تنظیم کی لیڈر شپ میں رہ کر بہت ہی نازک معاملات میں سے SAS کو کامیابی سے آگے بڑھاتا رہا۔ اس کی ادبی فکری نشستیں بہت ہی باقاعدہ رہیں، اس کی انتظامی کمیٹیوں کے اجلاس مقررہ اوقات میں منعقد ہوتے رہے اور اس کے باقاعدہ اور مسلسل الیکشن ہوتے رہے ۔ سنگت سعید موجودہ قیادت میں شامل تھا اور ڈپٹی جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھا۔ اور یہ تقریباً طے بات تھی کہ وہ اگلے الیکشنوں میں اکیڈمی کے اعلیٰ عہدوں تک جا پہنچتا۔

سعید مستوئی اپنے علم، دلیل، دھیمے انداز اور ہر دل عزیزی میں ثانی نہ رکھتا تھا۔ وہ بہت مطالعہ کرتا تھا۔ ایک مبارز کی سی ذہنیت میں زندگی بتاتا رہا۔ اسے درد کو چھپانا آتا تھا۔ سعید تعلق نبھانے والا شخص تھا۔ دردِل کا مالک۔ پیار دینے والا، ہنسنے ہنسانے والا۔ وہ ایک حیرت انگیز ساتھی تھا۔ ایک باایمان، مستقل مزاج، فہمیدہ روشن فکر ساتھی!! ہنس مکھ شخص، خیر خواہ شخص اور سادہ منش

سنگت۔ انسان دوستی پر پکے ایمان کے ساتھ بہت عرصے سے بیمار یہ شخص جب سنگت اکیڈمی کی آخری میٹنگ میں شامل ہوا تو اس کا ہیموگلوبن صرف 7 گرام تھا۔ وہ اپنا علم و تجربہ، دوسروں میں بانٹنے کی نیت سے سنگت اکیڈمی کی میٹنگوں کے مقام یعنی اکیڈمی ادبیات کے دفتر کی سیدھی اور دشوار گزار تین منزلہ سیڑھیاں بہت مشکل سے چڑھ پاتا تھا۔ ہال کے اندر آتا تو حسبِ روایت ہر شخص فرشی نشست سے اٹھ کر اُس کا استقبال کرتا۔ اور جب وہ اپنے ٹیچر کے قریب آتا اور وہ بھی کھڑا ہو کر اسے گلے لگاتا تو وہ کہہ اٹھتا: ''سر! آپ تو کھڑے نہ ہوں!!''

پندرہ نومبر 2009ء کو بلوچ آسمان کا یہ سرخ ستارہ اپنے جھرمٹ سے ٹوٹا اور ہزار نوخیز مستوئیوں کو زرخیزی عطا کرنے زمیں دوز ہوا۔ میں ابھی بھی اچھی بلوچ روایت کے مطابق اٹھ کر آنے والوں کا استقبال کرتا رہوں گا، مگر اب اُس میں شرماتا ہوا، احسان مندانداز اختیار کیا ہوا اور احترام وانسانی شرف سے لدا ہوا سعید نہ ہوگا۔

اپنے دوست کو یاد کرتا ہوں تو یہ سوچ کر اچھا لگتا ہے کہ وہ اپنے ہی ہم فکروں میں رہا اور انھی کے بیچ مرا۔ دعا ہے کہ باوقار لوگ اس باوقار انسان کی زندگی اور نظریات سے توانائی حاصل کرتے کرتے، اُس سے ملنے سرخرو ہو کر جائیں۔

عزیز مینگل

(9 فروری 1947............6 نومبر 2014)

جس شہر کی گلیوں میں کچھ آشنا چہرے گھومتے پھرتے نہ ہوں تو وہ شہر اجنبیت کا صحرا ہو جاتا ہے۔ انسان، اور وہ بھی آشنا انسان ہی شہر کو رہائش کے قابل بناتے ہیں۔ کمرہ خواہ ساکن ہو یا چلنے والا، کنکریٹ کا ہو یا لوہے اور پلاسٹک کا، کال بیل رکھتا ہو یا ہارن............ ایک دوسرے انسان کے وجود کے بغیر صرف اور صرف قبر ہوتا ہے۔ وہ قبر خواہ ایدھی مردہ خانے کی یخ بستہ سردی والی ہو یا سبی وڈھاڈر کے سورج کے ساتھ ایک نیزے کے فاصلے والی، قبر تو قبر ہوتی ہے۔

پروفیسر عزیز مینگل کوئٹہ کو قبرستان کی بجائے شہر کی شکل دینے والے لوگوں میں سے ایک تھا۔ باوقار گھومتا تھا، ترتیب کے ساتھ، توازن کے ساتھ، وضع داری کے ساتھ۔ شہر صاف تھا تو وہ بھی بے پرواہ گھومتا تھا، مگر جب ٹریفک وشور کی کثافت بڑھتی گئی تو عزیز جان بھی ناک اور منہ پہ رومال، اور کانوں آنکھوں میں نظر نہ آنے والے فلٹر فٹ کیے گھومتا تھا۔ آلودگی اُسے زہر لگتی تھی، آلودگی خواہ فضا کی ہو یا نیت وارادوں کی۔ عزیز مینگل صاف مطلع کی صاف آکسیجن کا متلاشی رہتا ہے۔ بغیر تالا رکھے ایک ویسپا سکوٹر جہاں چاہا موڑ دیا، جس دوست کے اڈے پہ چاہا پارک کر دیا۔ شہر کی بڑھتی ہوئی مسافتوں نے تقاضا کیا تو ایک ننھی سی گاڑی لے لی۔ اور عمر نے مطالبہ کیا تو بیٹے جمیل کو ڈرائیونگ سیٹ پہ بٹھا کر خود ساتھ بیٹھ لیے۔

شہر کوئٹہ کو grace اور شائستگی عطا کرنے والے سیکڑوں لوگوں میں عزیز جان بھی شامل

تھا۔ وہ جسمانی طور پر، طبیعت میں، اور نیت میں ایک neat انسان تھا۔ وہ رواداری کا مجسم نمونہ تھا، برداشت، خوش مزاجی، استدلال، متانت و سنجیدگی کی مثال تھا وہ............ملنسار عزیز جان۔ وہ نہ پتلا تھا نہ موٹا، نہ بہت طویل نہ پستہ قد۔ گوری رنگت کا عزیز اپنی چمکتی آنکھوں اور پرکشش چہرہ کے ساتھ تبسم میں لپٹی نرم گفتاری لیے ایک خوش گوار تاثر دیتا ملتا۔ انجماد کو توڑتا ہوا عزیز، سکوت کو کفن کرتا عزیز، محفل دیوان مجلس کا عزیز، عزیز مینگل۔

عزیز مینگل کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ تعصب سے پاک تھا، نفرت سے دور تھا۔ وہ اوہام پرستی کے سخت خلاف تھا۔ تعویذ، گنڈا، دم، اور چلّہ کے بہت خلاف تھا۔ وہ کڑھتا رہتا تھا کہ ساری ریاست (اور اُس کے ادارے یعنی عدالیہ، انتظامیہ پارلیمنٹ، میڈیا) ہمہ وقت ان ہتھکنڈوں میں لگی ہے کہ کس کس طرح عام لوگوں کو جاہل رکھا جائے۔ صرف ریاست نہیں بلکہ ہماری ریاست کے سارے بین الاقوامی اتحادی مثلاً امریکہ، یورپ، آئی ایم ایف، سعودی عرب اور ایران اسی مقصد کے لیے پانی کی طرح پیسہ بہا رہے ہیں۔..........اور یہ شجر ایک دو برس سے نہیں بلکہ سو سال سے پانی اور کھاد پا رہا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہرسُو جہالت کا دور دورہ ہے۔ عام آدمی ہو یا سائنس کا پی ایچ ڈی ہو، ذرا سا کھودیے تو اندر سے توہمات کی بھری اوجھری ملے گا۔ عام سپاہی سے لے کر جرنیل تک، عام وکیل سے لے کر چیف جسٹس تک اور رپورٹر سے لے کر ایڈیٹر تک کسی نہ کسی پیر کے دیے ہوئے منتر سے خود کو بیماریوں، اور آفات سے بچائے رکھتا ہے۔ اس ملک کا ہر شخص کالی بلی کی راہ کاٹنے سے ڈرتا ہے، بلاؤں کو دور بھگانے دنبے کاٹتا ہے اور ایک پیر پکڑتا (مرشد بناتا) ہے۔ ہماری سرکاری و نیم سرکاری اکیڈمیوں میں لباس و خوراک و رہائش کو زور زبردستی سے مذہبی بنانے پر کتابوں پہ کتابیں چھپتی رہی ہیں۔ سائنس کانفرنسوں میں جنت کی حوروں کے ہیموگلوبن لیول کا حساب لگایا جاتا رہا ہے۔ یا خرگوشوں پہ تجربات کر کے کلونجی اور زیتون کو امرت دھارا بننے پر مقالے در مقالے پڑھے جا رہے ہیں۔ اور چار کالی بکریوں کا صدقہ دے کر ایوانِ صدر میں داخل ہوا جا رہا ہے۔ عزیز کتنے بڑے سیلابی دریا کے خلاف سینہ سپر رہا تھا۔ عزیز مینگل روشن فکر شخص تھا۔ وہ ملّا، پیر اور سردار کی

کرامت وغیرہ کو نہیں مانتا تھا۔ اسباب و علل کے نظریے پہ چلتے ہوئے وہ حادثہ، وقوع اور کرامت وغیرہ کو مسترد کرتے ہوئے ہر واقعے کا فطری قوانین کے پس منظر میں مطالعہ کرتا تھا۔

جمیل بتاتا ہے کہ اگر وہ کبھی گھر کے لیے فروٹ اچھا نہ لاتا تو عزیز خوب مذاق اڑاتا۔ بینائی چیک کروانے کا کہتا، پیسے برباد کرنے کا مذاق اڑاتا۔ مگر ایک بار وہ لگاتار تین چار دن داغ دار اور زخمی پھل لاتا رہا۔ اب کے ہماری باری تھی اُس کا مذاق اڑانے کی۔ ''بابا بوڑھے ہو گئے، آنکھیں کم زور ہو گئیں............'' وغیرہ وغیرہ۔ پھر اُس نے عجب بات بتائی کہ شام کو گھر واپسی پر راستے میں ایک بہت بوڑھا آدمی ریڑھی لگائے امید بھری نظروں سے ہر راہی کو دیکھتا ہے۔ مجھ سے رہا نہیں جاتا، اُس کی ریڑھی پر موجود بچے کھچے پھل خرید کر اُس کا دل خوش کر دیتا ہوں۔ مجھ سے اُس کی امید، بے امیدی میں بدلتے نہیں دیکھا جاتا۔

اس دانش ور نے اپنی مادری قومی زبان براہوئی میں ادب کی تقریباً ہر میدان میں گھڑسواری کی۔ براہوئی زبان میں اُس کا بہت بڑا کام تھا۔ براہوئی زبان پہ بہت دوستوں نے کام کیا۔ جن میں عزیز مینگل اور گل بنگلزئی سرِ فہرست ہیں۔ اُس نے خیام کی رباعیات کو براہوئی میں منظوم کر ڈالا، ہمنگوے کے ناول The old man and the Sea کو براہوئی میں ترجمہ کیا۔ براہوئی کی ساری اصناف میں شاعری کی حتیٰ کہ ہائیکو اور ماہیے میں بھی۔ اس نے براہوئی میں افسانے لکھے، اُس کے قدیم الفاظ کو محفوظ بنایا۔

عزیز مینگل بے شمار کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کی شاعری کی دو درجن کتابیں ہیں: شیشپہ، چبڑہ، تلوسہ، شیروشکر، شپانک، شوال، شمبلاخ، برفیچ، جمجلائی، شلی، تلمل، چفنکہ، زبکہ، تیرونک، بیلی، شوشکو۔ بچوں کے لیے کتابیں: (1) ماما مرجان۔ (2) جلونا جن۔ (3) دغو جان (بچوں کے لیے نظمیں) شیروشکر (تحقیق) ذکری مذہب (ترجمہ)۔ مگر وہ لسانی موضوعات کا تو اسپیشلسٹ تھا۔ بلوچستان بھر میں کوئی اور ایسا شخص نہ ہوگا جسے دو سے زیادہ زبانوں کی لسانیاتی ساخت و پرداخت کا علم ہو۔ اس شخص نے ''نُہ زبانی'' لغت لکھی تھی (اردو، براہوئی، بلوچی، پشتو، فارسی، عربی، پنجابی، سندھی اور سرائیکی) جسے اردو سائنس بورڈ نے چھاپا۔ اُس شعبے میں اُس کی محنت لاثانی

ہے۔پھر اُس نے براہوئی کے ہندی اور سنسکرت سے رشتے براہوئی اور فارسی کے تعلقات اور ''پنجابی براہوئی لسانی رشتے'' پر ایک تحقیقی کتاب لکھی۔

وہ یہ کتابیں زیادہ تر خود اپنی ہی جیب سے شائع کرتا تھا۔ مارکٹنگ کیا ہوگی، خود ہی بانٹتا تھا۔مفت بانٹتا تھا۔

اُس شخص کی ایک اور قابلیت ٹی وی کمپیئر کی تھی۔ وہ براہوئی ڈرامہ لکھتا تھا، اداکاری کرتا تھا اور پروگرام کی میزبانی بھی کرتا تھا۔

عزیز جان ہمہ وقت نئے کام کے لیے جوانوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔عزیز مینگل قبائلیت کے سخت خلاف تھا، سرداریت اور اُس کی اتھارٹی کے خلاف تھا۔ وہ قبائلی نظام کے جامد رسوم و رواج کے خلاف تھا۔وہ قدیم اور ایکسپائر رسوم و روایات کی پیروی کو اجتماعی موت گردانتا تھا۔وہ بلوچ عوام کو سائنس اور ٹکنالوجی میں بہت آگے دیکھنا چاہتا تھا۔ادب، موسیقی اور فنونِ لطیفہ سے آشنا رکھنا چاہتا تھا۔عزیز طبقاتی سماج کا خاتمہ چاہتا تھا۔وہ امن انصاف اور برابری کے لیے کام کرتا تھا۔

سکوت و انجماد کا دشمن عزیز مہم جوئی کے بھی سخت خلاف تھا۔ وہ معروضی صورت حال کی مطابقت اور تقاضوں کے مطابق چلتے رہنے کے سائنسی فارمولے پر یقین رکھتا تھا۔

وہ بہت مرنجاں مرنج شخص تھا۔خوب صورت بلوچی، پشتو اور اردو بولتا تھا۔ بولنے کا اُس کا انداز بہت دھیما، رواں، اور جاری ساری والا تھا۔ بظاہر کم گو تھا جسے بلوچی میں ''گراں توار'' کہتے ہیں۔مگر جب ایک بار بولنے لگتا تو بولتا ہی چلا جاتا۔ڈاکٹر خدائیداد کی طرح۔عزیز جان محفل مجلس و دیوان کا آدمی تھا۔استادوں والا انداز۔علمی برتری نہ جتانے والا۔

وہ پیشے کے اعتبار سے بھی استاد تھا۔درس و تدریس سے وابستہ تھا۔ ماہر تعلیم تھا۔کمرشل کالج کوئٹہ میں بطور پرنسپل ریٹائر ہوگیا۔مگر اسی عزیز نے لوہاروں کے ہاں بھی محنت کی تھی، موٹر گیراجوں میں بھی مشقت کی تھی۔ وہ کلرک بھی رہا تھا۔

اتنا خوش اخلاق، اتنا خوش گفتار کہ کسی کا نام روکھے سوکھے انداز میں نہیں لیتا تھا۔ وہ ہر

ایک کے نام کے آخر میں لفظ ''جان'' کا اضافہ کرتا تھا۔ہمیں تو شیریں لہجہ اپنانے کے بھرپور مواقع حالات نے دے رکھے۔ یہ عادت ماما عبداللہ جان نے پہلے ہی لگا دی تھی۔عزیز جان اِس مکتب کی مدرسی میں نیا اضافہ تھا۔

پروفیسر سکندر کاسی نے بتایا کہ عزیز جان بہت اچھا جوڈو کراٹے کھیلتا تھا۔اسی نے یہ بھی بتایا کہ عزیز مینگل سنوکر بھی بہت اچھا کھیلتا تھا۔

عزیز مینگل سے بہت برسوں سے نیازمندی رہی۔مگر ابھی ڈیڑھ دو سال سے وہ سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے بہت قریب آ گیا تھا۔اور ہوتے ہوتے ایک لحاظ سے اُس کے رہنماؤں میں سے ایک ہوگیا تھا۔اُسے اِس اکیڈمی کے احباب میں کافی اچھائیاں نظر آئیں۔وہ اُس کی ہر میٹنگ میں لازمی طور پر شامل رہتا۔

وہ سنگت رسالہ کے مواد میں بہت دلچسپی لیتا۔اُس کے اداریوں کی بالخصوص تعریف کرتا۔سنگت بک شاپ کو کامیاب بنانے کے لیے ہر ماہ تین چار ہزار روپے کی کتابیں خریدتا تھا۔اُسے اپنی پسند کی اچھی سرگرمی مل گئی تھی۔وہ سنگت پوہ زانت کی ادبی محفلوں میں نہ صرف موجود ہوتا بلکہ تفصیل سے دلچسپی سے حصہ لیتا۔ایک نیا حلقہِ احباب دریافت کرنے پر وہ بہت خوش تھا۔زندگی کے آخری برسوں میں اُسے اپنی آئیڈیل جگہ مل چکی تھی۔وہ شاہ لطیف کی ان سطروں پر پورا اتر رہا تھا:

تیز ہوائیں چل رہی تھیں، ریت نے جسم کو ڈھانپ لیا تھا
جو کچھ معمولی سی زندگی رہ گئی، وہ محبوب کو دیکھنے کے لیے ہے!

اور یہاں ہمارے کیمپ میں بھی اُسے پا کر بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ایک سینئر جہاں دیدہ، پرکھا، آزمایا ہوا، کمیٹڈ ....ایسا ساتھی خدا ہر ایک کو دے!۔

اُس کا دوسرا ٹھکانہ ''بلوچستان سنڈے پارٹی'' کی محفلیں تھیں جو ماما عبداللہ جان جمالدینی کے گھر منعقد ہوتی ہیں۔اتوار کو۔گذشتہ پچیس برس سے، لگاتار، مسلسل۔عزیز جان اپنے اور ہمارے ایک اور اچھے دوست افضل مینگل کے ساتھ اتوار کو ہمارے درمیان موجود ہوتا۔ بہت

سرگرم طور پر اس کے مباحث میں حصہ لیتا۔ اتنا تکلف برتنے والا کہ واپسی پر جم خانہ پیدل جاتا تھا، کسی ساتھی کی گاڑی پر نہ بیٹھتا۔

پھر، عزیز جان رسالہ سنگت کے ایڈیٹوریل بورڈ کا ممبر بن گیا۔ اور بورڈ کی میٹنگوں کی سمجھو صدارت اور راہنمائی اُسی نے سنبھال رکھی تھی۔

ہمیں بعد میں اندازہ ہوا کہ عزیز مینگل کو اپنے کینسر کی بیماری اور اُس کے آخری سٹیج کا پتہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے بھی انسانی بہبود پر لگانا چاہتا تھا۔ ماہنامہ سنگت اور سنگت اکیڈمی کے مورچے اُسے میسر آئے۔ اُس نے ہم سب کو رفیقانہ مشوروں اور راہنمائی کے چابک سے دوڑائے رکھا۔ ہماری سرگرمیوں میں اُس زمانے کی تیزی عزیز مینگل کی بدولت تھی۔

ہم گذشتہ سترہ سال سے ''سنگت'' نکال رہے ہیں، اُس سے قبل دس برس ''نوکیں دور'' نکالتے رہے۔ مگر انکساری میں ہم نے کبھی اِن رسالوں کے سال نامے شائع نہیں کیے۔ اس بار عزیز مینگل نے بہت اصرار کے ساتھ سال نامہ شائع کرنے پہ ہمیں قائل کر دیا۔ اور خود اس سال نامے کی تیاری کمیٹی کا چیئرمین بن گیا۔ اُس نے اچھی خاصی تگ و دو شروع کی۔ ایک دو میٹنگوں کی صدارت کی۔

ایک ایسی ہی میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ اگلا پورا سال اُسی کی خوب صورت پینٹنگز کو رسالے کا سرورق بنایا جاتا رہے گا۔ چنانچہ اُس نے اپنے بیٹے جمیل جان کے ذریعے اپنی بے شمار پینٹنگز کی تصاویر بھجوادیں۔

پھر اچانک یہ ہوا کہ وہ کمر درد کی شکایت کرنے لگا۔ ریڑھ کی ہڈی میں شدید درد۔ کرسی پر بیٹھنا بھی تکلیف دِہ ہو گیا تھا۔ اُس کا وزن تیزی سے گرنے لگا تھا۔ وہ کراچی گیا علاج کے لیے۔ وہاں ہم فون پہ اس کی خیریت معلوم کرتے رہے۔ اس نے بتایا (سچ نہ بتایا) کہ ریڑھ کے مہروں میں سے ایک ٹوٹا ہوا ہے۔ وہاں ڈاکٹروں نے ریڈیوتھراپی کی اور درد مارنے کی بھاری دوائیاں دیں۔ شریف آدمی! ہمارا خیال تھا کہ ڈاکٹروں نے اُسے اصل بیماری بتائی نہ تھی، اور اُس کا خیال تھا کہ اپنی بیماری کو ہم سے چھپا کر ہمیں تکلیف نہ دے۔ جب کہ اسے بالکل پتہ تھا اپنی بیماری

کا۔ اور ہم بھی بچے نہ تھے کہ نہ جان سکیں اتنی تیزی سے وزن کو گرتے دیکھ کر۔ اور پھر ہڈی ٹوٹنے علاج بھلا ریڈیوتھراپی کب تھا؟۔ ہم دونوں اطراف ایک دوسرے سے جھوٹ بول رہے تھے۔ عزیز، جسے جھوٹ سے چڑ تھی، چار ماہ مسلسل ہم سے جھوٹ بولتا رہا۔

عزیز جان واپس آیا۔ مگر اُس کی صحت بہت بگڑتی گئی۔

ہم نے اُس سے درخواست کی کہ اب وہ ''بلوچستان سنڈے پارٹی'' کی اتوار والی نشستوں میں نہ آیا کرے۔ اُس نے یہ بات مان لی۔ مگر وہ دوسری محفلوں میں مکمل طور پر نہ جا کر بھی، سنگت اکیڈمی یا سنگت رسالہ کے ایڈیٹوریل بورڈ کی میٹنگوں میں زبردستی آتا رہا۔ اُس کا بیٹا بڑے عذاب سے اُسے موٹر سے اتارتا۔ میٹنگ کے دوران وہ کرسی پہ اکڑ کر بیٹھتا تھا۔ درد کی شدت سے بات تک نہ نکلتی تھی مگر وہ اپنی نحیف آواز میں بولتا ہی رہتا تھا بولتا ہی رہتا تھا۔

نومبر کی دو تاریخ کو اتوار کو سنڈے پارٹی کے سارے دوست اُس کے گھر گئے عیادت کے لیے۔ عزیز مینگل کا گھر، ایک گھر کے بجائے ایک آرٹ گیلری تھا۔ مگر، آج ہم غم کی آماج گاہ پہنچ گئے تھے۔ ہنستا ہنساتا عزیز مینگل، آج وہ دلکش و دلفریب عزیز نہ تھا۔ وہ تو ایک پلنگ پہ پڑا سمجھو لاش لگ رہا تھا۔ حرکت نہ کر سکتا تھا۔ بس پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کو پہچاننے کی کوشش کرتا، پہچان کر دیر تک ہاتھ پکڑے رہتا اور حال حوال پوچھتا رہا۔ اپنی تکلیف گویا بھول چکا تھا۔ اس نے بیٹے سے ہمیں اِس عظیم اور بھری ہوئی آرٹ گیلری گھمانے کا کہا۔ اور کیا پینٹنگز ہیں۔ فرانسیسی سفارت خانے نے ایک ڈھائی لاکھ روپے میں مانگی تھی جو عزیز جان نے نہیں دی۔ پھر تیس چالیس پینٹنگز اس نے اپنے اشعار پہ بنائی تھیں۔ پینٹنگ کو الٹا کرو تو اُس کی براہوئی رباعی لکھی ہے............ اس کے پورے گھر کے سارے کمروں کی چھتوں پہ ٹائلز لگی ہوئی ہیں۔ اور اُن ٹائیلوں پر گل کاری بھی عزیز کی اپنی ہے۔ اور ہم اُس کے ہاتھوں کا بوسہ لیے واپس لوٹے۔

ٹھیک چار دن بعد 6 نومبر کو اُس کے اپنے موبائل سے اُس کے انتقال کا ایس ایم ایس آیا۔ اُس موبائل سے جہاں سے ہر روز وہ اقوالِ زریں کے ساتھ مجھے گڈ مارننگ کا میسج کیا کرتا تھا۔

چھ سات گھنٹے قبل میں نے اُسے جلد صحت مندی کی خواہش کا میسج بھیجا تھا۔جس کا جواب 6 نومبر کی صبح یہ آیا،'' پروفیسر عبدالعزیز مینگل انتقال کر گئے ہیں''۔وہ ٹیکسٹ میں نے سارے احباب کو بھیجا۔جنید خان کا ایس ایم ایس تھا:'' بہت رنج کے ساتھ ہم سارے عزیز سنگتوں کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہمارا عظیم سنگت اور سکالر پروفیسر عزیز مینگل،ہمیں اداسی اور دکھ میں چھوڑ کر اپنی دائمی زندگی کے لیے روانہ ہوا۔اس کی تدفین سیٹلائٹ ٹاؤن قبرستان میں گیارہ بجے ہوگی''۔

وہ دو بیٹیاں اور جمیل شہزاد نامی بیٹا اُن کی اولاد،اور ہمارے بھتیجے بھتیجوں کے بطور چھوڑ گیا۔

عزیز جان کی کئی پیٹنگیس نامکمل رہ گئیں۔اُس کی کئی نظمیں ادھوری رہ گئیں۔اُس کی بہت ساری خواہشات،ارادے اور پراجیکٹ نیم مکمل رہ گئے۔اُسی کے اصرار پر سنگت سالنامہ کی تیاری ہو رہی تھی اور وہ اُسے بھی آدھے راستے میں چھوڑ گیا۔

قبرستان میں اُس کا بیٹا جب اشک بار آنکھوں سے مجھ سے بغل گیر ہوا تو کہنے لگا،'' بابا آپ لوگوں کو اپنا 'شہد جیسے میٹھے سنگت' کہہ کر یاد کرتا تھا۔''

آنکھیں نم ہیں............اس لیے بھی کہ ہم سنگت کے صفحے کے ایڈیٹوریل بورڈ پر نقش اُس کا نام کاٹ رہے ہیں۔''گویا اپنی جلد پر سے اُس کا نام کھرچ کر نکال رہے ہوں''۔

انوار احمد

(پروفیسر، ڈاکٹر............)

لفظ'' سانولا'' ہی ٹھیک ہے،مگر'' گچھے دار بالوں'' کا متضاد اس طرح لکھا جائے کہ سر پہ آسانی اور جلدی سے ہاتھ پھر جانے کی کیفیت پیدا ہو،کوتاہ قدی میں تین چار انچ کا ہی اضافہ کر دیں،بہت موٹاپے کو ذرا سا کم کر دیں،مزاح اور لفظ ہنس مکھ برقرار رہنے دیں،تین الفاظ یعنی، گپّی،مجلسی،اور قصہ طراز کو اکٹھا کر لیں،کمیونسٹی میں غریب کے سالن کی طرح اچھا خاصا پانی ڈال کر پتلا کر کے،'محتاط روشن خیالی' کا لفظ رہنے دیں،کاہلی کے لفظ کو اُس کے برعکس سے بدل ڈالیں،لفظ طلسماتی لکھ دیں،تیر و تلوار سے میلوں دور بھاگا مگر نوکِ قلم کی جگر بُری کا استاد کہہ دیں اور یہ فیصلہ نہ کرنے دیں کہ آج وہ نقاد،افسانہ نگار،اور خاکہ نگار میں سے کس شعبے میں زیادہ نام ور ہے تو جو شخص بنے گا،اُس کا نام اُس کے باپ مختار احمد نے اُس وقت انوار احمد رکھا،تھا جب وہ ملتان میں گیارہ جون 1947 کو پیدا ہوا تھا۔

یوں انوار احمد پاکستان سے دو ماہ تین دن بڑا ہے۔اور یہ دونوں ہم عمر،کرب و عذاب میں جیتے رہنے کا اشتراک رکھتے ہیں۔اول الذکر کا مختار احمد اُس وقت انتقال کر گیا جب دوسرے مختار احمد کی سب سے بڑی اولاد یعنی انوار احمد ابھی چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ثانی الذکر کا تو دو سال بعد کوئی ''اصلی'' رہا ہی نہیں!!۔دکنی،میسوری،جالندھری ''وہاں'' سے آکر اُس کے مالک بن بیٹھے۔اور یہ جو آج کے اُس کے نقلی مختار کار ہیں انہوں نے ایسی بے چاری ملت بنانی چاہی جو

''ملوکیت اور ملائیت'' کے بیچ فٹ بال بنی ہوئی ہے۔

پاکستان کا تو پتہ نہیں مگر انوار کے دوست اپنے والدین کے سامنے ''انوار پر سدا رشک کرتے رہے، کہ وہ بچپن میں ہی باپ کے سائے سے محروم ہو گیا تھا''۔(1)

انوار احمد کی بیوہ والدہ کے نام کا تو پتہ نہ چلا۔ مگر، مختار احمد کے انتقال پر وہ بیٹے کو ساتھ لے کر اپنے ماں باپ کے گھر گئی۔ اِس خاتون کے بارے میں انوار یہ دلچسپ بات کرتا ہے: ''بعض اساتذہ کے ہاتھوں اپنی غلط تربیت کے باعث مجھے کسی خاتون کا سگریٹ پینا اچھا نہیں لگتا، حالاں کہ میری اپنی ماں پہلے حقہ، پھر بیڑی اور آخر میں سگریٹ پیتی تھی''(2)۔ انوار نے اپنی نانی نانا اور دادا دادی کے بارے میں بے باکی سے بھی زیادہ بے باک مضمون لکھا جو اُس کی کتاب ''یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ'' کا پہلا مضمون ہے............ وہیں سے پڑھ لیں۔

انوار کی دادی سکھ باپ کی مسلمان شدہ بیٹی تھی۔ دادا تقسیم ہند سے بہت پہلے مشرقی پنجاب سے رحیم یار خان آیا تھا۔ چار پانچ برس کی عمر میں اس کا دادا اور دادی انتقال کر گئے، چند ماہ آگے پیچھے۔

''وہ بستی باغبان میں رہتے تھے، بیچ میں ایک مختصر ندی تھی اور پھر وہ اصلی نواں شہر تھا، جس میں ہجرت کے بعد آنے والے مہاجرین یا ان کے کرایہ دار تھے۔ ہماری کلاس میں بھی اکثریت ان بچوں کی تھی، جو کئی بار پٹ کر بھی جہاز کو جاج اور علم اور حسن کو ایلم اور حوسن کہتے تھے، شاید عادتوں اور رسموں کا بھی کچھ فرق تھا مگر میری ماں سرائیکی محاورے میں کہا کرتی تھی کہ پاکستان آتے ہوئے راستے میں ان کے ساتھ بڑا ظلم 'کمایا' گیا ہے، تب مجھے پہلا سبق ملا کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں: ایک وہ جن کے ساتھ ظلم کمائے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا حریص جی ایسی کمائی سے کبھی نہیں بھرتا اور یہ کہ جو بھی چاہے کہ وہ راہ خوب صورت ہو جائے، جو خوش حال، خود دار اور جمہوری پاکستان کو جاتی ہو، اُس پر ضرور ظلم کمایا جائے گا''

اُس سکول کے قریب ہی گل ٹیکس کا کارخانہ تھا، جہاں سے وہ چادریں اور تکیے کے غلاف لا کر اس کے پلو کاڑھتے تھے، یوں اب اُس کی ماں اس کی استاد تھی، اس نے سوئی میں دھاگہ

ڈالنا اور کڑھائی کے کام کی تربیت دی۔ ''میَں اب تک ہر کام جلدی جلدی کرتا ہوں، اس لیے وہ کہا کرتی تھیں، تم 'دھڑا نگے بھرتے' ہو، نفاست کبھی تمہارے کام میں نہیں آسکے گی''۔............ ہاں چھوٹی عمر سے گل ٹیکس کی چادروں کے پلو سینے کی بدولت مجھے پاکستان میں پائی جانے والی ہر قسم کی چادروں بلکہ ان میں ٹانگیں پھیلانے والوں کی اوقات بھی سمجھ میں آنے لگ گئی۔''

میں دوستوں اور خصوصاً زندہ دوستوں کے بارے میں ہمیشہ خوشی خوشی سے لکھنا چاہتا ہوں، اور بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میں بے شمار ''مرحوم'' لوگوں پر لکھ چکا ہوں۔ وہ ایسے کہ اُن کے عزت و احترام کے پرومیتھی اُسی زنجیروں نے میری انگلیاں باندھے رکھیں۔ مرحومین کے گرد شرف و احترام کا ایک ہالہ رکھنے کی روایت بلوچوں میں بہت پرانی ہے۔ اور یہ روایت مجھے پسند ہے۔ لیکن اپنی افتادِ طبع کی مطابقت میں جب اپنے زندہ دوستوں کے بارے قلم اٹھاتا ہوں تو جیسے عید ہو جاتی ہے۔ جیسے جوار کھاتے رہنے والے بلوچ کو گندم کی چپاتی مل جائے۔ پرزے اڑ جاتے ہیں اپنے بھی، ممدوح کے بھی۔ اس لیے کہ یہاں لبرٹیاں لینے کی بھرپور آزادی ہوتی ہے۔

میں ڈاکٹر انوار احمد کے بارے میں بھی ایسا کرنا چاہتا تھا۔ میں اِس حقیقت کا احترام کرتا ہوں کہ ہر انسان کی زندگی کی کچھ تہیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں وہ بہر حال پرائیویٹ رکھنا چاہتا ہے۔ اور میں انہیں نہ چھیڑتے ہوئے کم از کم ایسی باتیں ضرور کرنا چاہتا تھا، جس سے اُس چوغے میں دو چار چھید ہی پڑ سکیں جو کہ ہمارا ''دو چہرے والا سماج'' ایک ستر سالہ شخص کو اوڑھا دیتا ہے۔ میں اِس بات کا بھرپور طور پر قائل ہوں کہ یار دوست تو عام انسان کی طرح ہوتے ہیں۔ اُن کی عام انسانی مزے دار باتوں کی چونڈی کاٹی جانی چاہیے۔ میں اپنے ہم عصروں کو سپاس نامے پیش کرنے کو پرلے درجے کی منافقت کہتا ہوں۔

مگر یہاں، میں عملاً ایسا نہیں کر سکتا۔ بھئی مجھے ہر اُس شخص سے ڈر لگتا ہے جس کا ایک رہبر، پیشوا، یا استاد کی شکل میں معتقدین یا فالوئرز کا کوئی ٹولہ موجود ہو۔ گو کہ انوار نے اندھے تقلید کاروں کا کوئی باقاعدہ جتھا ترتیب نہ دیا، اور یہ شخص پاکستان میں روشن فکری پھیلانے کا اِس وقت

سب سے بڑا کھمبا ہے۔مگر (مجھ سمیت) ''شاگردوں'' کے نام سے اُس کے عزت کنندگان کا ایک وسیع حلقہ موجود ہے۔اور حلقہ جتنا بھی شعوردار کیوں نہ ہو، کسی بھی وقت پاگل بن سکتا ہے۔میں نے جدید ترین سائنس سے لیس، مثالی تنظیم میں منظم، اور لائن بنا کر چلنے والے بے شمار انقلابی حلقوں جتھوں کو پاگل بنتے صرف دیکھا ہی نہیں، بھگتا بھی ہے۔اس لیے، میں اپنی جان وجسم کی بقا کے صدقے انوار کو معاف کرتا ہوں۔اور کانٹے دار لگام پہن کر جتنا آزاد لکھ سکتا ہوں، اتنا ہی لکھ رہا ہوں۔

انوراحمد نے دَہ جماعتیں (مسلم ہائی سکول) ملتان سے پڑھیں۔اور 1963ء میں وہیں ایف اے میں داخل ہوا۔اور فرسٹ ڈویژن میں یہ کے ٹو سر کرلیا۔اس پڑھاکو نے ایف اے میں ہی پریم چند کے سارے ناول اور افسانے پڑھ ڈالے۔بی اے بھی (اردو اور سیاسیات کے اختیاری مضامین کے ساتھ) فرسٹ ڈویژن میں کرلی۔اردو میں شانزدھی (ماسٹرز) ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1969ء میں لی، ایک بار پھر اُسی فرسٹ ڈویژن میں۔اس کے تھیسس کا عنوان تھا: پریم چند کے ناول ''گئودان کا تجزیاتی مطالعہ''۔پنجاب یونیورسٹی سے ہی پی ایچ ڈی 1984ء میں کی۔(بلوچی میں پی ایچ ڈی کا متبادل ہندسوں میں موجود نہیں کہ اس درجے تک پہنچتے پہنچتے تعلیم گنتی اور ناپ تول سے بڑھ جاتی ہے)۔اُس کے ڈاکٹریٹ کے تھیسز کا ٹائٹل تھا: ''اردو مختصر افسانہ اپنے سیاسی اور سماجی پس منظر میں''۔

لیکچراری البتہ اِس کو بلوچستان نے دی۔اشرف انسانوں کی طویل، ذلت آمیز اور دکھ بھری جدوجہد کے بعد ون یونٹ، بالآخر لاہور کے گورنر ہاؤس میں دم توڑ چکا تو صوبہ بلوچستان قائم ہوا۔حکومت بلوچستان نے لیکچراری کی تین پوسٹیں مشتہر کردیں۔کسی مقامی شخص نے درخواست نہ دی۔انوار احمد سلیکٹ ہوگیا۔وہ سریاب روڈ کے ڈگری کالج میں مئی 1971ء میں اردو کا لیکچرار ہوا۔خلیل صدیقی یہاں پرنسپل تھا۔استاد شاگرد تعلقات خلیل صاحب سے بہتر کون اُسے سکھا سکتا تھا۔طلبا کو سچ کی تلاش کی راہوں پہ ہانکنا اُس نے اسی صدیقی صاحب سے سیکھا۔طلبا سے میٹھا بولنا تو نانا نے سکھایا تھا: وہ اُسے ہاں کہنے نہ دیتا تھا بلکہ کہتا ''جی'' بولو۔اور انوار جب ''جی'' بولتا تو وہ جواباً بولتا ''

کھیر کھنڈ پی''۔بزرگوں کی دعاؤں کی صورت اتنے کھیر کھنڈ پیے کہ زندگی بھر لہجہ شیریں ونرم رہا۔

......اور جو ایک بار بلوچستان آیا تو سمجھو نجات پا گیا (سوائے نسیم حجازی کے، کہ ایسوں کی آنکھوں، کانوں اور دلوں پہ بگ نیشن شاؤنزم کی مہریں یہاں آنے سے پہلے لگ چکی ہوتی ہیں)۔عبداللہ جان جمالدینی کا کوئٹہ نظریاتی طور پر انفیکٹ کردیتا ہے۔خلیل صدیقی، کرار حسین اور بہادر خان رودینی جیسوں کی موجودگی میں انوار جیسوں کا کلٹی ہوجانا مشکل تھا کیا؟۔بے دلیل سرزمین کا یہ نوجوان، دلیل ومنطق کی برسات میں کِھل کِھل اٹھا۔

غوث بخش بزنجو کی گورنری اور عطا اللہ مینگل کی وزارتِ اعلیٰ خواہ جس قدر بھی بلوچ ناشکری میں بے قدر رہیں، امیر محمد گورنر کے علاقے کے فرد کے لیے تو نعمتیں ہی تھیں۔ویسے آپ خود سوچیں مینگلوں کا سردار، بلوچستان کا وزیر اعلیٰ سٹاف روم میں بیٹھ کر اساتذہ سے کھلی ڈلی باتیں کرے تو یہ نعمت نہیں؟۔چنانچہ یہ شخص اپنی روح یہیں چھوڑ گیا۔اُس نے اپنی بچی کا رشتہ یہاں کردیا۔لہٰذا، آج انوار ایک نہیں، دو ہیں۔ایک وہ جو دنیا بھر میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے، دوسرا یہیں شال وادی میں موجود، اپنے محور کے گرد گردش کرتا ہوا انوار۔

انوار بلوچستان سے محبت کرتا ہے۔یہ تھینک فل انسان یوں کہا ہے: ''ملتان سے میری محبت تو فطری ہے مگر میرے دل کے تمام راستے بلوچستان کو جاتے ہیں۔اس سرزمین اور اس کے لوگوں یا اداروں کا ذکر آئے تو یادیں کہرام برپا کردیتی ہیں............''۔(3)

مگر، بلوچستان میں اُس کا قیام اس قدر طویل نہ تھا۔وہ دسمبر 1972ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن میں کامیاب ہوا اور اپنے دیس سدھار گیا۔(گورنمنٹ کالج رحیم یار خان)۔

مجھے اُس کی شادی کی اصل تاریخ کا پتہ نہیں مگر اتنا جانتا ہوں کہ شادی کا اعلان اُس نے شادی کرنے کے بہت سال بعد کیا تھا۔اور اُسی کی زبانی یہ بھی جانتا ہوں کہ ''اُس کی بیگم اُسے رنڈوا ہونے کا اعزاز بخشنے کے بجائے بیوہ ہونا زیادہ پسند کرے گی''۔(4) اُس کی ایک بیٹی کا نام ڈاکٹر نویرہ ہے۔دوسرے بچوں بچیوں سے ملا نہیں ہوں اور معلومات بھی نہیں ہیں۔

ڈاکٹر انوار دس جون 2007ء تک وہاں ملتان رہا۔وہاں بہت طویل نام والی یونیورسٹی

میں شعبہ اردو کا چیئر مین بنا، مگر سچی بات ہے کہ اس کی روزی حلال اُسی وقت ہوئی جب وہ سرائیکی ڈیپارٹمنٹ کا چیئر مین بنا۔ اور پھر وہ بہت سے ڈیپارٹمنٹس کے مجموعے کے ''متحدہ مجلسِ عمل'' کا ڈین بھی بن گیا۔

ڈاکٹر انوار احمد نے اپنی زندگی کی تین تخلیقی دہائیاں اِس یونیورسٹی کی نذر کر دیں۔ ''وہ بہت اچھے استاد ہیں۔ وہ تنقید کا مضمون اس قدر مؤثر انداز میں پڑھایا کرتے تھے کہ ان کا پیریڈ ختم ہونے پر افسوس ہوتا تھا۔ پڑھاتے وقت وہ اپنے ہر شاگرد پر اس طرح نظر رکھتے تھے کہ ان میں سے کسی کے لیے بھی کسی اور طرف توجہ دینا ممکن نہ ہوتا تھا۔ اُن کا اور اُن کے شاگردوں کا تعلق صرف پڑھنے پڑھانے تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ ان میں سے اکثر کے نجی حالات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ وقت پڑنے پر ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ وہ اپنے ہر شاگرد کو اتنا عزیز رکھتے ہیں کہ ان کے سب شاگرد ان کی محبت کو اپنے لیے مخصوص سمجھنے لگتے ہیں۔ ذکریا یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے ابتدائی دور کے طالبِ علم اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ اس زمانے میں ان طالب علموں کو ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے اور ان کی پُر لطف گفتگو کا لطف اٹھانے کا شرف حاصل ہو جاتا تھا............

''شائستگی، ہمدردی اور دوسروں کے کام آنا ان کی ایسی خوبیاں ہیں جن کے باعث ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے''۔(5)

اُس نے وہاں اردو ڈیپارٹمنٹ کو پاکستانی یونیورسٹیوں میں سے اعلیٰ ترین ڈیپارٹمنٹ بنانے کے لیے دن رات محنت کی۔ خلیل صدیقی ریسرچ لائبریری قائم کی جس میں سال 2008ء تک بارہ ہزار دو سو تیس کتب اور دو ہزار نو سو چونسٹھ جرائد موجود تھے (6)۔ اس نے اس ڈیپارٹمنٹ کو خطے کے سب سے جان دار، اور روشن فکر سماجی علمی تحقیقی مرکز میں ڈھال دیا۔ ڈاکٹر انوار احمد وہیں ریٹائر ہو گیا۔ مگر، اردو ڈیپارٹمنٹ کو روبینہ ترین، نجیب جمال اور قاضی عابد جیسے محنتی اور جینوئن ہاتھوں میں دے گیا۔

ایک زمانے میں ملتان میں ''پاکستان ٹیچرز فورم'' نامی ایک تنظیم ہوا کرتی تھی، جس میں پرائمری ٹیچر سے لے کر یونیورسٹی وائس چانسلر تک اساتذہ منظّم تھے۔ یہ تنظیم عمومی طور پر تعلیم،

نصاب، اساتذہ اور طلبا کے عام مسائل اور خواندگی سے لے کر اعلیٰ ترین ڈگریوں تک کے معاملات پر کام کرتی تھی۔ ہم بھی یہاں، کوئٹہ میں ہر وقت اُسی طرح کی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ یہاں امیر الدین ہمارا امام ہوا کرتا تھا۔ ایک بار اِس تنظیم کا پورا وفد ہمارے پاس کوئٹہ آیا۔ اسی وفد میں ہم انوار، ڈاکٹر کرامت اور اُن کے جگری یار اور راہنما مہر گل محمد سے واقف ہوئے۔ اور اس دورے کے بعد ملتان کے روشن فکر عالموں سے ہماری دعا سلام مسلسل جاری رہی۔ ڈاکٹر انوار اور ڈاکٹر کرامت پُل تھے۔ (پروفیسر برکت تو بلوچ ہے، اُسے تو ہم ملتانیوں کو دیکھنے کو بھی نہ دیں!)۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انوار گویا دوبارہ نوجوان ہوا۔ لوگ اس عمر میں بیٹھ کر ''اللہ اللہ'' کرنے کے ساتھ ساتھ جی بھر کے غیبتیں کرتے ہیں، مگر انوار کبھی سورج کے ملک کے دورے کرتا رہا اور کبھی شبِ دیجور میں تنکوں کے نیچے چھپے کنوئیں پھلانگتا رہا۔ (اسی بے آرام فطرت کے سبب دادا، ننھے انوار کو 'رُلدو' کہا کرتا تھا)۔ خود تو کہتا ہے کہ ''میں نے دنیا کے جہنم کو اتنا عرصہ دیکھا اور اس کا لطف لیا ہے کہ جنت میں جانے کی آرزو بھی نہیں''......(7)

وہ ڈیپوٹیشن پہ 1995ء سے 1999ء تک (یعنی چار برس) انقرہ یونیورسٹی ترکی میں ''اردو ڈیپارٹمنٹ'' سنبھالتا رہا اور وہاں یونیورسٹی سطح کی (ایم فل، پی ایچ ڈی) تعلیم دیتا رہا۔ پتہ نہیں سفید فاموں کے اُس ملک میں وہ ''نیلی مسجد'' دیکھنے کتنی بار گیا ہوگا!۔ قونیہ تو نہ صرف اس نے خود دیکھا بلکہ فی سبیل للہ اور سیاحوں کو بھی دکھاتا رہا۔ مولنا روم بھی دلچسپ ولی ہے۔ پاکستان سے جتنے لوگ بھی اُس کی زیارت کو گئے، اُن میں ایک فیصد کے علاوہ باقی سب رشوت میں پلے عوام الناس کے دشمن بیوروکریٹ تھے، یا حلال روزی سے قطعی ناواقف سرمایہ دار!!۔ اور مولنا نے انہیں کچھ نہ کہا۔ بلکہ وہ وہاں کی تصویریں، سوونیرز اور قصوں کہانیوں سے یہاں اپنی حرام خواری کو دن دگنی چگنی بڑھاتے چلتے جاتے ہیں۔ کم از کم ایک کی صورت تو ریچھ کی بنا ڈالتا۔

2007ء کو ڈاکٹر انوار احمد گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے بھاگ جگانے چلا گیا اور 2009ء تک وہاں علم کے موتی بکھیرتا رہا۔ اردو کے پروفیسر، چیئرمین اور زبانوں کے ڈین کے بطور۔ ہم نے وہاں اُس کی تربیت شدہ فصل اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔

پھر وہ 2009ء سے لے کر 2011ء تک دو سال اوسا کا یونیورسٹی جاپان میں اردو پڑھاتا رہا۔ چند لازوال افسانے وہاں اُس کا حاصل بنے۔

ہر کمال کو زوال ہے ناں!۔ سو اُسے زوال آ گیا اور وہ واپس آ کر ''جوڑ توڑ'' جیسی کاروائی میں مقتدرہ قومی زبان کا چیئرمین بنا۔ یہ الگ بات ہے کہ جسے خدا زنگ نہ لگوانا چاہتا ہو اُسے کسی کا چاچا بھی خراب نہیں کر سکتا۔ ساری زندگی ماسٹری کرتے رہنے والے انوار کی گردن میں یہ حقیر ریوالونگ چیئر، کیا سیخ ڈال سکتی تھی۔ کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں کہ انوار جس خوب صورت کام پہ دفاعی رویہ اختیار کرتا ہے وہی تو وہاں پہ اُس کا اصل کارنامہ تھا: اُس نے شہنشاہی نام بدل کر اُس ادارے کو انسانی نام دے دیا۔ (اُس کے اِس کارِ خیر میں اُس کے پیش رووں اور ہم جیسے اُس کے ہم کار افتادگانِ خاک کا بھی حصہ ہے)۔ مقتدرہ گیا ہوا میں، اور ادارے کا نام اُس زبان کی 'ترقی' کا ادارہ بنا۔

وہ جون 2011ء سے دسمبر 2012ء تک مقتدرہ اردو کا چیئرمین رہا۔ گولی مارئیے چیئر کو، چیرمینی کو، یہ آدمی خمیر سے ہی چیئرمین نہیں، ٹیچر لگتا ہے۔ اول تا آخر۔ چیرمینی میں بھی اس نے وہی کام کیے جو ایک استاد کو کرنے چاہیے تھے۔ پی ایچ ڈی کے تھیسزوں کو چھاپنے کا کام، وہاں کے ماہوار رسالے کو رسالہ نما بنانے کا کام، سنجیدہ فکری موضوعات پہ سیمینار و اجتماعات کرتے رہنے کا کام......

ڈاکٹر انوار احمد خالی خولی باتیں نہیں کرتا بلکہ بغیر بتلائے جتلائے انسانی شعور و تربیت کے لیے عملی کام کرتا رہتا ہے۔ اس نے بے شمار لوگوں کو خواندہ ہی نہیں بنایا، محض تعلیم یافتہ ہی نہیں بنایا، بلکہ باشعور بھی بنالیا۔ وہ لوگوں کو اکیڈمیشن نہیں انٹلکچوئل بناتا ہے۔ آپ بلوچستان سے نکلیں، اور ''سکھ پنجابیوں'' اور ''مسلمان پنجابیوں'' کے باہمی بارڈر واہگہ تک جائیں، راستے میں جہاں بھی درس و تدریس کا کوئی معتبر سٹیشن ہوگا وہاں کا سٹیشن ماسٹر انوار احمد کا شاگرد ہوگا۔ اور ایسا ویسا نکما سٹیشن ماسٹر نہیں کہ ٹرین جہنم لائن میں چلی جائے، بلکہ محنتی اور حلال کھانے والا سٹیشن ماسٹر۔

جس وقت اسلام آباد میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز نامی تنظیم متحرک تھی تو میں وہاں

اُس کے ایک اجلاس میں گیا۔ وہاں مجھے روالپنڈی علاقے کے ایک دور دراز کالج کا ایک لیکچرار ملا۔ ذرا سا کریدا تو پتہ چلا کہ وہ بھی انوار کا مرید تھا۔ میں نے اُس مرید سے حیرت کا اظہار کیا کہ تمہارے اِس ''آکٹوپس'' انوار نے کہاں کہاں تک اپنے سوڈوپوڈز پھیلائے ہوئے ہیں۔ رشک و رفیقانہ مقابلہ قبائلی انسانوں کا ایسا وصف ہوتے ہیں جو انہیں دشمنی کی حد تک لے جاتے ہیں۔ انوار اپنی قسمت کو دعائیں دے کہ وہ مجھ سے (دنیاوی و عاقبتی دونوں لحاظ سے) ہزار گنا بلند مرتبت ہے۔ پہنچ سے باہر ہے، اس لیے ہر بار گلے میں پہاڑی کریلے کی تلخی جھیلتے ہوئے اُس کی عظمت نگل جاتا ہوں۔ اپنے رشک کو حسد میں نہ بدلنے دیتے ہوئے میں نے اُس لیکچرار سے ایک نیا فرقہ کھڑا کرنے پر بہت بحث مباحثہ کیا۔ میں نے اس فرقے کا نام بھی تجویز کیا: ''فرقہِ انواریہ''۔ ہم دونوں اس پر رضامند ہوئے۔ مگر بہت ساری شیخ چلیاں چھوڑنے کے بعد معلوم ہوا یہ فرقہ تو پہلے ہی سے وجود رکھتا ہے۔

انوار نے آخری خبریں آنے تک اٹھارہ پی ایچ ڈی اور 17 ایم فل پیدا کیے تھے۔ اور مجھے یقین ہے کہ پاکستانی یونیورسٹیوں میں بے حرمت و بے کرامت ڈگری پاشی کے برعکس انوار کی پیدا کردہ یہ کوانٹٹی، کوالٹی سے مبرا بالکل نہ ہوگی۔ ایک رجعتی بلکہ بنیاد پرست تعلیمی نظام میں وہ پی ایچ ڈیاں اس قابل تو نہیں کہ میں احباب کو انہیں پڑھنے کی سفارش کروں مگر اُن کے اندر عمومی اور بازاری بہاؤ سے کچھ مختلف مواد ضرور ملے گا۔ یہ میری چھٹی حس کا ایمان ہے۔ (کچھ کو میں نے دیکھا اور پڑھا بھی ہے!)۔

ڈاکٹر انوار احمد نے استاد کے پیشے کو 40 برس دیے ہیں۔ پارٹ ٹائم نہیں ہمہ وقت تربیت کنندگی کے چالیس سال۔ اس کے شاگردوں میں سے درجنوں ایسے ملیں گے جن کی ذاتی زندگی اور ذاتی معاملات تک کو سلجھانے کا کام اِس استاد نے کیا ہے۔ بغیر کسی اکتاہٹ کے، بغیر کسی بےزاری کے، اور بغیر کسی قسم کا احسان جتلانے کے۔ (فطری بات ہے کہ وہ اگلے جنم میں بھی استاد بننا چاہتا ہوگا!!)۔

انوار ہم سب کی طرح چھوٹی موٹی دنیاداری کرتے رہنے کے باوجود دل میں پکا آدرش

وادی ہے۔ادب اُس کا میدان بنا تو اُس نے ادب کے ساتھ محبت جاری رکھی۔ میں اُس کی دوسری والی کسی محبت کے بارے میں نہیں جانتا،مگر میرے ساٹھ سالہ نیم سفید بالوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ انوار اِس کرامت والی نعمت کے بغیر اتنا تخلیقی و پیداواری شخص بن ہی نہیں سکتا تھا۔(ایک مسئلہ یہ بنتا جارہا ہے کہ اب ہم پرانے زمانے کے لوگ محبت، عشق، اور عورت بازی میں کنفیوز ہو کر رہ گئے ہیں۔محبت بے چاری ایک ایسا لفظ ہے جس کے ساتھ بہت کھلواڑ ہوتا رہا ہے۔ پہلے تو مسیحیت نے محبت کے غبارے میں ہوا بھر بھر کر اُسے آفاقی ٹائپ کی چیز بنا ڈالا۔ پھر مولنا روم نے حدیں سرحدیں ربڑ پنسل کردیں۔ کچھ ہمارے اپنے تجربوں کا معاملہ بھی ہے۔کوئی کنفیوژن، کوئی مسئلہ نہ ہوتا اگر ہمیں قبائلی نظام میں رہنے دیا جاتا۔اس لیے کہ جنسی معاملات میں قبائلی نظام اور سرمایہ داری نظام میں کئی باتیں مشترک ہیں۔غضب تو فیوڈل ازم نے کردیا۔ پردہ، پھر محبت، پھر عشق، عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی..........جاگیرداری نے اس سارے باب کا منہ کالا کر کے رکھ دیا۔اصطلاحات کی سبکی کے اِس خطے میں رہنے والا ہر شخص دو دو چہرے لیے پھرتا ہے..........انوار اور اس کا قبیلہ اس بات کا مجسم گواہ ہے)۔

محقق انوار احمد کے اپنے مقالوں کی سنچری پوری ہونے کو ہے۔میں اُن چالُو عنوانات کا ذکر نہیں کرتا جن کی کسی نہ کسی طرح ریاستی آشیر باد کے تحت عملی دنیا میں فورسپس ڈلیوری کرائی جاتی ہے، اور جن میں ہر نام ور قلم کار کسی نہ کسی صورت پھسلتا رہا ہے۔مثلاً سر سید احمد خان کی روشن خیالی، علامہ اقبال کی خرد افروزی، اردو محبت اور یکجہتی کی زبان، یا، یوسف عزیز مگسی تحریکِ پاکستان کے راہنما، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جس میں انوار جیسے بہت سے شرفا اپنی فکری خواہشات کو مصنوعی اور بے جوڑ انداز میں جُڑا دیتے دیتے بے لذتی کے بے شمار غسل کرتے رہتے ہیں۔ میں تو اُس کے ''دل دماغ کی آواز'' مقالوں کی بات کر رہا ہوں کہ آخرت میں اُس کا توشہ یہی ہوں گے۔اور یہ مقالے تقریباً سو ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد درجن بھر کتابوں کا لکھاری ہے۔جن میں افسانے ہیں، خاکے ہیں، ناول، خود نوشتیں، تحقیقیں اور تنقیدیں ہیں۔ اُس کی ایک کتاب اردو ادب کے معمار'' شوکت

صدیقی'' اکیڈمی ادبیات سے شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں اس کی تصانیف یہ ہیں: اردو افسانہ تحقیق و تنقید، تحریکِ آزادی میں علامہ اقبال کا کردار، یک جا۔

انوار لفظ کو کبھی بھی پُر معنی بنائے بغیر استعمال نہیں کرتا۔سرینداکی ہر تار کی طرح انوار کا ہر لفظ نمایاں اور الگ آہنگ کے ساتھ بولتا ہے۔اُسے اس بات پہ عبور حاصل ہے کہ اپنی بات کو کن الفاظ کے ساتھ، کس موڈ اور کس لہجے میں قاری تک پہنچائے۔ہم آہنگ سوچ، ہم آہنگ الفاظ۔

وہ تیزی تیزی میں جزئیات کو کبھی پھلانگتا نہیں۔ وہ جزئیات ہی کو جوڑ جوڑ کر کہانی بناتا ہے۔جزئیات کی نظر اندازی کی کوئی قتل گاہ اس کے ہاں وجود نہیں رکھتی۔

''یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ'' نامی اُس کی کتاب میں عام ماوشما کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اس میں شان دار لوگ شامل ہیں: خلیل صدیقی، عرش صدیقی، فرمان فتح پوری، مرزا ابنِ حنیف، مہر گل محمد، اصغر ندیم سید، ڈاکٹر سلیم اختر، ....۔ 228 صفحات ضخیم اس کتاب کے عنوانات ہی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی تحقیق کا میدان کتنا وسیع اور متنوع ہے۔

اِس کے چند فقرے دیکھیں:

''پہلے لکڑی ٹوٹی اور پھر میرا حوصلہ، جب میرے باپ نے زہریلے لہجے میں پوچھا ان سب بچھوؤں کو تم مار سکے ہو؟ میں روتا ہوں کہ کیا بیٹے سے باپ کو یہی کہنا چاہیے، وہ مجھے یہی کہہ دیتا کہ رات کے ختم ہونے کا انتظار کرو''۔

''..........میرے بہت سے شاگرد ہیں جو اعتکاف میں بیٹھنے سے بھی پہلے مجھ سے پوچھتے ہیں، کہ آپ کے لیے کیا دعا مانگی جائے اور میں اُن سے کہتا ہوں کہ اپنے اللہ سے کہو میرے شاگردوں کی زندگیوں میں دکھ کم نہیں کرسکتا تو اُن کی ہمت ہی بڑھا دے''۔

''ہم بزعمِ خویش اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں، کیوں کہ ہمارے پاس ہر سوال کا جواب موجودہ ہے، ہر شعبہ حیات میں ہمارے پاس یا ہمارے پسندیدہ اسلامی تاریخی ناول نگاروں کے ہاں مثالی نظام بھی موجود ہیں، جن سے دنیا بھر کے کفار ہراساں ہیں۔ایسے خود فریب معاشرے میں ذہنی ترقی رک جاتی ہے، ریاکاری فروغ پاتی ہے۔''

''یہاں 'خودفریبوں' یا مثالیت پسندوں' کی بڑی تعداد ہے، جو یقین رکھتے ہیں کہ باؤلا کتا اپنے مالک کو نہیں کاٹ سکتا اور گریڈوں، کرسیوں، شہرتوں، اربابِ اقتدار کی قربتوں کی تمنا میں دیوانے ہو جانے والے لوگ دستار بدل بھائیوں اور دوپٹہ بدل بہنوں کو گزند نہیں پہنچا سکتے۔''

ضیاالحق کی موت پر جب اُس کے حامیوں نے اُسے شہید قرار دیا تو انوار نے اُسی روز ایک محفل میں کہا،'' علامہ اقبال کے مصرعے، شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے، کا مطلب اب سمجھ میں آیا ہے'' (8)۔

ایک اور فقرہ............'' اس نے مجھے ...... کمپوزنگ کی دس بارہ غلطیوں کی ایک فہرست بھی بنا کے بھیجی، جس میں '' دورِضیاع'' کے بارے میں لکھا کہ عین فالتو ہے''۔

''............ کف بہ لب، سنگ در دست مہربان نہیں جانتے کہ حسن کو سنگسار نہیں کیا جا سکتا اور صداقت کو سولی پر نہیں لٹکایا جا سکتا، کسی عہد میں بھی شپرہ چشم، آفتاب کو بجھا نہیں سکتے''۔(9)۔

ایک اور فقرہ:'' ...... دو چار مرتبہ تو کسی خطاب کے دوران اور اپنے کالموں میں بھی مجھے 'سقراط' سے مماثل قرار دیا، جس پر میں نے دست بستہ التجا کی کہ لوگوں کی نظروں میں سقراط کی عزت تو رہنے دیں، مجھے تو اپنی بیوی کے سامنے بھی سچ بولنے کی توفیق نہیں ہوتی''۔(10)

ایک اور فقرہ:'' اجمل نیازی کے سفرنامے 'مندر میں محراب' کی تقریب رونمائی...... میں میں نے نیازی سے کہا بھی کہ تم میرے اظہارِ رائے کی تاب نہیں لا سکو گے، جب کہ میں تم سے اپنے دوستانہ مراسم برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ اُس نے کہا، نہیں تم کُھل کے بولو۔ میں آدھا کُھل کے بولا، اس نے مجھے ملک دشمن قرار دے کر پہلے پمفلٹ لکھا، اور پھر میرے پسندیدہ سکھ کی طرح '' مور اوور'' کہہ کر دو کالم............''۔(11)

محسن نقوی کے بارے میں انوار نے لکھا:'' وہ خاص طور پر شوکت حسین رضوی کی وضع داری کا ذکر کیا کرتا تھا اور بتایا کرتا تھا کہ میں اُن کی مجلس پڑھنے سے پہلے اُن کے قالین یا ایئر کنڈیشنر کی تعریف کر دوں تو واپسی پر اِن اشیا کو میں اپنے گھر میں پاتا ہوں۔ میں نے کہا،'' ایسے لوگ اس لیے بھی جلدی کرتے ہوں گے کہ کہیں تم اُن کی گھریلو اشیا کی بجائے افرادِ خانہ کی تعریف

پر نہ اتر آؤ''۔(12)

کہانی کا قصہ پن تو اس کے افسانوں کی اولین خاصیت ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کی کہانیاں 1947ء کے بعد اُبھرنے والی نسلوں کی بے اطمینانی، عصری انتشار، سیاسی و معاشی مذہبی صورت حال کا خوب صورت بیانیہ ہیں۔ یہ کہانیاں ترقی یافتہ ممالک کی تہذیب و معاشرت کو بھی اُجاگر کرتی ہیں۔

مجموعہ '' آخری خط'' 29 افسانوں پر مشتمل ہے۔ اُس کی کہانیاں نہ صرف صنف افسانہ کو متنوع موضوعات و نئی تکنیک اور اُسلوب سے آشنا کرتی ہیں بلکہ یہ انوار احمد کا روایت کی پاس داری کے ساتھ ساتھ جدت اور منفرد فن کار کے طور پر شناخت کراتی ہیں۔

مزاح تو اُس کی ہر کتاب کے ہر صفحے کے ہر پیرا گراف میں ملے گا، مگر فکشن اور تنقید اُس کے اصل میدان ہیں، جہاں اُس نے اپنی تحقیق کا خوردبین فِٹ کیے رکھا۔ ایک موٹی سی کتاب، '' اردو افسانہ .... ایک صدی کا قصہ'' تحقیقی و تنقیدی ہے۔ انوار کی تنقید میں کوئی یکسانیت کوئی بوریت نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی ہمہ جہتی ہے، آفاقیت و عالمگیریت ہے، ایک وسیع النظری، گہرائی اور گیرائی ہے۔ سٹائل تو اُس کا معلوم ہے کہ اُس میں بڑا تیکھا پن، مزاح کے ٹوٹے، طنز کے پھول اور بلا کی بلاغت موجود ہوتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس کی تحریروں کی براعظمی طوالت میں کوئی ایک کلومیٹر بھی ایسا نہیں ڈھونڈ پایا جہاں سبزہ جیسی شگفتگی موجود نہ ہو۔ اگر اُس کی کتاب کا سرورق پھٹا ہوا بھی ہو تو اچھے، گہرے اور دلکش فقرے مائل سٹون کی طرح جا بجا آپ کی رہنمائی کریں گے کہ آپ انوار احمد کی تحریر پڑھ رہے ہیں۔ اس کی تنقید کی پہلی کتاب '' خواجہ فرید کے تین رنگ'' کے عنوان سے بزمِ ثقافت ملتان سے 1985ء میں شائع ہوئی تھی۔

انوار رجعتی تحریروں اور لکھاریوں کو اپنا نشانہ بناتا ہے، مسلسل، مستقل اور نپے تلے انداز میں دلیل کو بڑھانا، اوہام پرستی سے نجات دلانا اور انسان سے محبت کرنا .... بس یہی بات اچھائی ہے اُس ہرجائی کی۔ وہ اپنا معیار برقرار رکھتے ہوئے ماضی پرستی کو ٹھونگیں مارتا جاتا ہے۔ اس رجحان نے اُسے ایک اچھا محقق اور ایک اچھا تخلیق کار بنا ڈالا۔

اُس کے منطقے میں دھرم کو سیاسی بنے سیکڑوں سالوں کی طویل عمری نصیب ہوئی ہے۔ حاکم ذہنیت کی زہر میں بجھی ادبی تلوار، جب بھی کارگر نہ رہے تو وہ جھٹ پنج سورہ نکال لائے گی۔ اور بلوچستان پہ پانچویں بار کی فوج کشی جیسے بڑے جرم تک کو بھی کامیابی کے ساتھ اُس میں چھپا دے گی۔ انوار اُس منطقے کے بھی عین مرکز میں رہتا ہے۔ کمال ہے کہ پھر بھی اس نے حق پرستی کی اپنی زبان پہ میل نہ جمنے دی۔ وہ مزاحمت بھی خندہ پیشانی سے بیان کرتا ہے، گرفت سے بچتے ہوئے بات کہنی سکھاتا ہے.......... معاشی طبقاتی تضادات، اور ظلم و جبر کے خلاف بات۔ وہ چلتے چلتے میں، بس گپ شپ میں سماجی طنز کا ایک آدھ ٹھوکا دے مارتا ہے۔ ایسے ہی معصومیت کی شیطانی!! (بلوچی میں شیطانی، شرارت کو کہتے ہیں)۔ اسی طرح وہ بدعتوں کی مذمتی لاؤڈ سپیکر کا متولی رہتے رہتے خود ایسی ادبی بدعتیں کر جاتا ہے کہ ''لا ابالا'' کہہ کر ہر کوئی بغیر گوشمالی کیے آگے پڑھتا جاتا ہے۔ فقرہ ایسا مارتا ہے جیسے شہ مرید کی مضبوط کمان سے نکلا تیر ہو، کاٹ دار۔ بھئی اُس کے سماج سے متعلق اس کا یہ پیراگراف پڑھے بغیر تو میں آپ کو بالکل جانے نہ دوں گا:

''...... ہمارے ہاں فرید جیسے ثقافتی اور تخلیقی Icon کو مجاوروں نے کچھ اس طرح بھی گھیرا کہ بسا اوقات مطالعۂ فرید کے لیے بہت سے دروازے بند محسوس ہوئے کیوں کہ ہمارے ہاں شعر و ادب کے قارئین کی اکثریت کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے ہے، جن میں سے بیشتر کا تاریخ سے رشتہ جنابِ نسیم حجازی کے ناولوں کے ذریعے قائم ہوا، اپنے وطن کی شادمانی اور اسلام کے حوالے سے نشاۃ الثانیہ کے خوابوں کی آبیاری کبھی نعمت اللہ شاہ ولی کی پیش گوئیاں کرتی ہیں، کبھی نمازِ عید کے موقع پر مناجات سے مماثل دعائیں کہ اللہ تعالیٰ کفار کی توپوں اور طیاروں میں کیڑے ڈال یا باری تعالیٰ ہمیں فتح دے بغیر لڑے۔ اس طبقے کے اخلاص اور دردمندی سے کون انکار کرسکتا ہے مگر جذباتیت اور رقت پر مبنی ہمارا اخلاص اپنی سرزمین سے دور ہیرو، غازی اور مجاہد تلاش کرتا ہے جو ساری دنیا کو تبدیل کیے بغیر اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں یا گم ہو جاتے ہیں اور ہم ان کی بازیابی کے خوابوں میں پھر کچھ صدیوں کے لیے سو جاتے ہیں۔ یہ بھی ہماری جذباتیت ہے کہ ہم عالمِ اسلام کے متحد ہونے کی آرزو تو رکھتے ہیں ان کے موجودہ غاصبانہ سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کی تبدیلی

کے لیے ذرا بھی غور نہیں کرتے، ہم نفاذِ اسلام کو نفاذِ تعزیرات خیال کرتے ہیں، فراہمیِ مراعات یا رعایات نہیں، ہم اس دنیا کو جنت بنائے بغیر آدم کے ہاتھ سے نکلی ہوئی جنت کے بارے میں من چاہا خواب دیکھتے ہیں، شرحِ خواندگی اور معیارِ زندگی جنوبی ایشیا کے ملکوں تک میں سب سے پست رکھنے کے باوجود خود کو دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت خیال کرتے ہیں، زراعت میں فرسودہ طریقے استعمال کر کے بھی خوش حالی اور خود کفالتی کے خواب دیکھتے ہیں، دنیا کے طاقت ور ترین ملکوں کے حاشیہ بردار بن کر خود کو ان کا اتحادی اور دوست خیال کرتے ہیں، آمریت کے سایوں میں تشکیل پانے والے اداروں اور افراد سے جمہوری رویے کی توقع رکھتے ہیں، کئی عشروں سے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے کشکول کے باوجود خود کو غیور سمجھتے ہیں، 14 اگست کو سرکاری جوش کے ساتھ یوم آزادی منا کر اپنے بچوں اور بھائیوں کو ٹرالروں اور کنٹینروں میں بند کر کے اجنبی زمینوں اور ساحلوں کے حوالے کرتے ہیں، ہم بھی کیا دلچسپ لوگ ہیں، اپنی تعمیر سے قاصر مگر ہم میں سے بہت سے بزعمِ خویش معمارِ قوم کے منصب پر فائز اپنی ذات کی معرفت سے بے گانہ مگر اجتماعی عرفان کے لیے چلہ کشی..........'' (13)۔

ہماری نسل کا بھلا وہ کون سا شخص ہوگا جس کے گلے کی طرف ضیاالحق کا طبعی یا فکری خونی پنجہ نہ بڑھا ہو۔ انوار اور اُس کے سارے احباب پر بھی سختیوں کا موسم آیا۔ نوکریوں سے برطرفیاں، دور افتادہ مقامات پہ تبادلے، الزامات، مقدمات، گرفتاریاں........... اِس ٹیچر پر پی آئی اے کا طیارہ اغوا کرنے کا الزام لگا۔ مجھے یقین ہے کہ انوار نے زندگی میں صنفِ مخالف میں سے کئی اوں کو اغوا کرنے کی خواہش کی ہوگی اور اِس ارادۂ گناہ پر عمل نہ کرنے کی سزا بھی اس نے خوب پائی ہوگی۔ مگر جہاز کا اغوا؟ بھئی اُس شخص کی بُنت ہی ایسی ہے کہ وہ جہاز پر بیٹھنے سے قبل سلامتی کی آیتوں کو سو بار پڑھتا ہوگا، اغوا تو بہت بڑی بات ہے۔

چنانچہ، مارچ 1981ء میں اُس کے وارنٹ گرفتاری نکلے۔ روپوشی کی مشاورت پہ عمل کیا اور جان بچائی۔ ضیا دشمنی میں انوار کا شمار اگلی صفوں میں ہوتا ہے، مگر اُس کی یہ ضیا دشمنی شخصی نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا نشانہ وہ رجحان ہے، جس سے سماج میں ضیاالحق بنتے ہیں۔

''ضیاالحق دور میں ہم دو چار دوست ہر ایسا کام کرنے کے لیے تیار رہتے تھے جس سے کہ عوام یا جج یا فوج اُس کا تختہ الٹ دے (کیا رومانوی سوچ تھی)۔شیعہ حضرات نے جب زکات کے حوالے سے تحریک شروع کی، اور اسلام آباد کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی اور اس حوالے سے خبریں شائع ہوئیں، تو میں نے یہ جذباتی تجویز پیش کی کہ اے بی اشرف، ارشد ملتانی، شفیع اختر اور میری طرف سے ایک پریس ریلیز جاری کیا جائے کہ ڈکٹیٹر کے خلاف شیعانِ حیدر کرار کی تحریک سے متاثر ہو کر ان سب نے بھی شیعت قبول کر لی ہے......''(14)۔

ڈاکٹر انوار کی ہمیشہ کوشش رہی کہ لوگوں کو ذمہ دار شہری بنایا جائے۔ چنانچہ وہ کوئی رسالہ کوئی کتاب مفت نہیں پڑھتا، پیسے دیتا ہے۔ اور اُس کی تشہیر کرتا ہے تا کہ دوسرے لوگ بھی تقلید کریں اور ''مفت خوانی'' والا رواج ختم ہو۔اُس نے اپنے رسالہ ''پیلوں'' کے ایک اداریہ میں یوں لکھا: ''جو لوگ اس شمارے کو خرید کر پڑھیں گے اُن کے لیے ابھی سے ممنونیت کے جذبات''۔

ڈاکٹر انوار اس لحاظ سے بھی اچھا آدمی ہے کہ وہ لوگوں کو لکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ لکھے کو چھاپنے کے وسائل کرتا رہتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شائستہ جمال کی سرگزشت لکھنے کے لیے وہ شائستہ سے الگ اصرار کرتا رہتا تھا اور پھر اُسے 'سنگت' کے اندر شائع کرنے کے لیے مجھے الگ قائل کرتا رہتا تھا۔آج وہ صاحبِ کتاب ہے (اُسے صاحبِ کتاب بولنے والوں کو میری نفرت پہنچے)۔

انوار احمد جب ذکریا یونیورسٹی میں تھا تو خلیل صدیقی صاحب کو ہر سال دو تین ماہ کے لیے لسانیات کے کورس کی تدریس کے لیے بلاتا تھا۔ تو ''ایک کلاس کو میں نے اُن کے پیچھے ڈالا کہ ہمیں آپ کے لیکچر امتحان کے وقت بھول جاتے ہیں، ہمیں کچھ لکھ کر دیجیے۔ یوں دو کتابیں وجود میں آ گئیں: ''زبان کیا ہے'' اور ''آواز شناسی''۔(15)

ڈاکٹر انوار نے روشن فکر ادیبوں، دانش وروں کی فکری ہم آہنگی کے لیے سیمیناروں، کانفرنسوں اور کانگریسوں کی شکل میں بے شمار مواقع فراہم کیے۔

ڈاکٹر انوار کی ایک بہت بے ثمر خدمت اور مہارت، روشن فکر ادیبوں کی تنظیم کاری کی کوشش رہی ہے۔اس نے 2007ء میں ملتان میں ایک بڑی کانفرنس بلا کر زبردست انداز میں اس

پیدائشی طور پر ودیعت شدہ ٹوٹتے رہنے کی ''صلاحیت'' والی تنظیم کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح وہ ہر ادبی اکٹھ میں اس متبادل سوچ کو پروان چڑھانے کی سعی ضرور کرتا ہے۔کبھی کبھی کامیاب بھی ہوتا ہے، اکثر نیم کامیاب ہوتا ہے، اور ناکامی کا تناسب تو ثریا ستارے جتنا بلند ہے۔کوئی تخلیقی فارمولا ابھی تک ایسا سامنے نہ آیا کہ اس ملک میں کوئی دیرپا ادبی فیڈ ریشن، یا کنفیڈ ریشن قائم ہو۔ مرکزیت والی تنظیم تو خیر ممکن ہی نہیں کہ غیر اعلانیہ ون یونٹ نے سماج کے کپڑے کا ایک ایک دھاگہ ادھیڑ ڈالا ہے۔

انوار ''رائٹ'' سیمیناروں میں ''لیفٹ'' کا واحد اور اکلوتا نمائندہ ہوتا ہے۔ نہ جائے تو بے چین ہوتا ہے کہ: چُھٹتی نہیں ہے کافر منہ کو لگی ہوئی۔ جاتا ہے تو آخر میں خود کو پشیمان پاتا ہے، اور ہمیں نہ جانے کی نصیحتیں کرتا ہے۔ایسی دل نہ خواستہ جگہوں میں ''چَس'' تو بہت ہوتی ہے مگر بندہ روحانی طور پر رُل جاتا ہے۔............''خالی کنستروں جیسی بے برکت آوازیں سننے والا'' اب ایک دو اجتماعات سے غیر حاضر پایا گیا۔(ہم اُس کی اس تبدیلی پہ بہت خوش ہیں اور اُس کے پڑوس بہاول پور میں موجود اپنے یار پروفیسر نجیب کے بھی اِس بیماری سے شفایاب ہونے کی خواہش کرتے ہیں)۔

انوار احمد نے ''وعدہ خلافی'' کے عنوان سے اخبار میں کالم لکھنے کا تجربہ بھی کیا۔ وہ کچھ عرصہ تک اچھے دلچسپ کالم لکھتا رہا۔ بعد میں آخر'' گھوڑا بھی تو انسان ہے تھک ہی جاتا ہے'' کے مصداق اُسے یہ شعبہ ترک کرنا پڑا۔''راضی خدا خود ہوا بہانہ سموبنی'' کے مصداق پالیسی پہ اختلاف نے اُسے اِس بے مراد کام سے نجات دلوائی۔

وہ ایک ویب سائٹ پہ بھی سماجی سیاسی مضامین لکھتا رہا۔

وہ جتنا خوب صورت لکھتا ہے، اتنا ہی خوبصورت بولتا ہے۔ڈاکٹر انوار احمد باغ و بہار شخصیت کا مالک ہے۔اس کی حسِ مزاح نے اس کی شخصیت میں ایک خاص طرح کی انفرادیت پیدا کر دی ہے۔خود ہنسنا اور دوسروں کو ہنسانا اسے خوب آتا ہے۔اتنا بولتا ہے، اتنا بولتا ہے کہ محفل میں وہ کسی کو کھانسنے چھینکنے یا جمائی لینے تک کے لیے منہ کھولنے بھی نہیں دیتا۔ ذرا کم بولو نا یار!۔

ابھی حال میں وہ ملتان سے ایک کثیر اللسانی سہ ماہی رسالہ ''پیلوں'' نکالنے لگا ہے۔ پنجابی، سرائیکی اور اردو میں۔ قاری، لکھاری، خریدار، اور چندہ بردار سب کے سب اُس کے اپنے شاگرد ہیں۔ کتنا بڑا حلقہ ہے اس کا!!۔

پھر وہ ایک عجیب کام یہ کرتا ہے کہ جس یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے وہاں غریب طلبا کے لیے ایک مستقل فنڈ قائم کرتا ہے۔ اپنی کتابیں ملک بھر میں پھیلے اپنے شاگردوں کے موجود نیٹ ورک سے خریدواتا ہے اور وہ پیسہ سیدھا اُس بینک اکاؤنٹ میں جاتا ہے جو اِس مقصد کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔

یار کے نیک کاموں میں دس بارہ کتابوں کی فروخت ہمارے ذمے میں آجاتی ہے۔

کوئی مجھے بڑے سے بڑا واسطہ دے کر بھی کہے کہ میں انوار کی بڑائی اُس کے حاصل کردہ پرائیڈ آف پرفارمنس، علامہ نیاز فتح پوری ایوارڈ، بیسٹ پلے رائٹ ایوارڈ، اور بیسٹ ٹیچر ایوارڈ جیسی حقیری دنیاوی فُٹوں سے ناپ لوں، تو میں تین دفعہ انکار کروں گا۔ انوار بہت بڑا آدمی ہے بھائی!۔

انوار کا شمار تو خیر کارواں کے سالاروں میں ہوتا ہے، اگر وہ اُس کے قبیلے کا عام فرد بھی ہوتا تو بھی ہم اُس پہ واری ہو جاتے۔ بھئی کوئٹہ سے روانہ ہو جائیں تو سبی، ڈیرہ مراد جمالی اور اوستہ محمد تک درمیان کوئی سٹاپ نہیں ملے گا، جہاں انسان دو چار گھڑی کسی باوقار انسان دوست اور فہمیدہ کارکن کے ہاں ستا لے۔ ملتان سے پہلے علم ودانش وکمٹمنٹ کی کوئی سرائے، کوئی مہمان خانہ نہیں۔ ملتان، جہاں انوار ہے، روبینہ ترین ہے، قاضی عابد ہے، ملک محمد علی بھارا ہے، میاں اقبال ہے، مہر اللہ مری ہے، لالین ہے۔ الغرض اس کی سوچ کا پورا قبیلہ آباد ہے۔ اس قحط الرجالی میں انوار تو آنکھوں کا تارا ہوگا ہی۔ وہ اس لیے بھی ہمیں پیارا ہے کہ کبھی کبھار اِدھر اُدھر دنیاوی پینلٹیاں مارتے رہنے کے باوجود، اُس نے بیلچہ ابھی تک نہیں پھینکا۔ نئے پودوں کی کاشت اور کونپلوں کی آبیاری کا بیلچہ!۔

حوالہ جات

1-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 52

2-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 118

3-بلوچستان کی دل آمیز شخصیتیں۔ روزنامہ ''دنیا'' 17 ستمبر 2012۔

4-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 46

5-شائستہ جمال۔ زندگی اک تماشا۔ 2013۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 88

6-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 98

7-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 98

8-شائستہ جمال۔ زندگی اک تماشا۔ 2013۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 90

9-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 41

10-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 42

11-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 42

12-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 71

13-انوار احمد، ڈاکٹر۔ مقالہ در کتاب ''خواجہ غلام فرید سیمینار''۔ 2007۔ بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان۔ صفحہ 35

14-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 103

15-انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز۔ فیصل آباد۔ صفحہ 97

اکبر بارکزئی

اکبر بارک زئی 1939ء میں شکار پور میں پیدا ہوا۔تعلیم وتربیت کراچی میں ہوئی۔وہیں سے میٹرک کیا۔سندھ مسلم کالج کراچی سے بی اے کرلیا۔1950ء کے اواخر میں روسی انقلاب کے زیر اثر آ کر سماجی اور سیاسی ناانصافیوں کے خلاف لیاری میں لینن گراڈ سرکل قائم کیا، جس کے تحت جلسے، سٹڈی سرکلز، میٹنگیں، سیمینار، جلوس منعقد ہوتے تھے۔اس گروپ نے عوام الناس میں زبردست اثرات پیدا کیے۔اور لیاری کی سیاست کو وہ رخ عطا کیا جو اگلی نصف صدی تک اس کی قسمت بنا رہا۔اسی لینن گراڈ سرکل سے آگے چل کر لیاری سٹوڈنٹس فیڈریشن بنی، جس نے 1967 میں بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن میں ڈھلنا تھا۔

ایوب آمریت کے آخری برسوں میں بھٹو کے ذریعے لینن گراڈ سرکل کو رام کرنے کی کوشش کی گئی مگر جلسہ کرنا تو دور کی بات لیاری میں الٹا اُس کے اپنے خلاف جلوس نکل گیا۔پھر ایوبی آمریت کی طرف سے لینن گراڈ سرکل پر زبردست یلغار ہوئی اور اس کے لیڈر و کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ان میں سے کچھ کو ملک چھوڑنا پڑا۔

لیاری میں بلوچی اکیڈمی بنائی۔وہ اس کا سیکرٹری تھا۔اسی کی کاوشوں سے دانش وروں نے مل کر ''بلوچی زھگ بلد'' مرتب کر کے شائع کر دی۔

اکبر نے، بہت ہی خوب صورت شاعری کی۔بارکزئی قبیلے کا یہ روشن فکر شاعر بلوچی زبان میں اس نظریے کے نمایاں شعرا میں سے ہے۔اُس کی شاعری بلوچ قومی زندگی کا آئینہ ہے۔وہ اسی

نظریے کا سیاسی ورکر بھی تھا مگر شہرت، قلم سے پائی۔

رجعتی پاکستانی سرکار اکبر اور اس کے رفقا کی سیاسی وعلمی سرگرمیوں سے سخت خوف زدہ ہوئی اور اکبر کی گرفتاری کے لیے آستینیں چڑھالیں۔وہ زیرزمین چلا گیا اور مینگل خان مری کے قلمی نام سے شاعری خلق کرتا رہا اور مکران کے راستے خلیجی ممالک میں پھسل گیا۔یہ جلاوطنی زندگی بھر کے لیے تھی۔بغداد سے بلوچی اخبار نکلنا کتنی بڑی حیران کن خبر ہے۔مگر اکبر جان نے ایسا کیا۔اخبار کا نام تھا: ''تپا کی ئے راہ''۔اکبر مجبور ہو گیا اپنے وطن سے نکلا۔اکبر نے بلوچی کے علاوہ فارسی اور اردو میں بھی کچھ شاعری کی۔''روچہ کئے گشتہ کنت'' اس کا بلوچی شعری مجموعہ ہے۔

اکبر بارکزئی بہت خوبصورت نظم لکھتا ہے۔فلسفیانہ، گہری اور پُر معنی۔بہت روانی ہے اس میں۔قوم وعوام کی بہتری کی خواہش والی شاعری۔مینگل خان مری کے نام سے کی گئی اس کی بہت ہی خوب صورت شاعری میں نے پڑھی ہے پرانے رسالوں میں۔اکبر بارک زئی مکمل طور پر غریب طبقے کی شاعری کرتا ہے۔اور سوشلسٹ انقلاب کی خواہش رکھتا ہے۔شاید اب تک کی بلوچ شاعری کی تاریخ میں اکبر وہ واحد شخص ہو گا جس نے اپنی رفیقہِ حیات کی تعریف میں شاعری کی ہو۔'' وتی لوگی بانک طاہرہ ئے ناما'' نامی نظم بلوچ شاعری میں ایک ایفل ٹاور کی حیثیت رکھتی ہے۔وہ اپنی بیٹی لالین کے حوالے سے ساری بلوچ بیٹیوں کو انکار کی جرأت ملنے کی دعا کرتا ہے۔ذرا انکار کی دعا اپنی نظم کے چار مصرعوں کا ترجمہ تو ملاحظہ ہو:

تیری زباں کو راس رہے ''اِنّاں''
زندگی کی مٹھاس ہے ''اِنّاں''
سب سے شیریں ساز ہے ''اِنّاں''
زندگی کے حسن کا راز ہے ''اِنّاں''

گشکوریوں کا بھانجا

جاوید اختر

پچھلی صدی کے دوسرے نصف کا زمانہ تھا۔ مقام، سبی بلوچستان۔ بات مزدوروں کی ہے، ریلوے مزدوروں کی، دور ریلوے مزدوروں کی۔ ان میں سے ایک لیہ کے علاقہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام عطا محمد، وہ کوئلہ والا انجن ڈرائیور تھا۔ دوسرا بھی ریلوے میں ملازم تھا، لاغر او رکنگال اور لاوارث غلام قادر گشکوری سکنہ مل گشکوری' سبی۔ نچلے طبقے میں دوستیاں ہی ممکن ہوتی ہیں، دشمنیاں کون پال سکتا ہے۔ اور اگر دشمنی ہو بھی تو اتنی تعداد میں غیر رسمی امدادِ باہمی کی ضرورت پڑتی ہے کہ اوپر سے بے شک دوستی نہ ہو مگر ایک دوسرے کی مدد کے بغیر زندگی ناممکن ہو جاتی ہے۔..........ان دونوں کی تو زبردست دوستی تھی۔

گشکوری بیمار بیمار سا رہتا تھا۔ اس کی ایک بچی تھی، ایمنڑ اں بی بی۔ ایک روز اس نے اپنی بچی اپنے دوست عطا محمد کے حوالے کی کہ مرگ و زند کا کیا بھروسہ؟ مروں تو بچی کا کوئی ولی وارث نہ ہوگا۔ تم میرے دوست ہو، اسے پالو پوسو، بڑی کرو، اور اپنے دونوں بیٹوں میں سے کسی سے بیاہ دو۔ انسان تو بہت بلا واسطہ ہوا کرتا تھا۔ اور انسان کا انسان پہ اعتبار بہت ہوا کرتا تھا۔ اور اس اعتبار کو پالا بھی بہر صورت جاتا تھا۔

عطا محمد اپنے یار قادر گشکوری کی بچی کو اپنے آبائی علاقہ لیہ لے گیا۔ اسے پالا، بڑا کیا، تربیت کی اور اپنے بیٹے محمد افضل سے بیاہ دی۔ ہموار طور پر، عام انسانی روٹین جیسا۔ اُس گشکوری

خاتون ایمنڑ اں کا بیٹا جاوید اختر ہے۔ جس کی رفاقت پہ میں نازاں ہوں۔

جاوید کے علاوہ ایمنڑ اں بی بی کے تین اور بیٹے ہوئے دو بڑے، پرویز اور محمد رفیق۔ ایک چھوٹا محمد حنیف نام کا۔ جاوید نے ہائی سکول سے لے کر بی اے تک لیہ میں تعلیم حاصل کی۔ وہیں مدرسہ بھی پڑھا، فارسی عربی، صرف ونحو بھی۔ خیال امروہی کے قافلے میں رہ کر فارسی ادب سے اچھا خاصا واقف ہوا۔ انگریزی میں ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ اور بلوچستان یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ پھر وہ سکول ٹیچر بن کر تین سال تک میرے ضلع کوہلو میں میرے ماموں خیل قبیلہ مہنداڑیوں میں رہا۔ مڈل سکول بالا ڈھاکا میں۔ 1993ء میں انگلش لیکچرار مقرر ہوا۔ قلات میں اب وہ اسسٹنٹ پروفیسر ہے۔ جاوید کے اپنے دو بیٹے (مصدق اور سجاول) اور دو بیٹیاں (مومل اور سومل) ہیں۔

گشکوریوں کا بھانجا، میرا یہ دوست مجھ سے دس برس دو ماہ چھوٹا ہے۔ قد بھی چھوٹا ہے۔ پدری زبان سرائیکی بولتا ہے، اور مادری زبان بلوچی سیکھ چکا ہے۔ براہوئی روانی سے بول پڑھ اور لکھ لیتا ہے۔ پنجابی اور سندھی خوب جانتا ہے، اردو اور انگریزی تو خیر بہت زیادہ جانتا ہے............
یوں وہ آٹھ زبانوں کے اندر پڑھتا، بولتا، کڑھتا، لکھتا ہے۔ جاوید ادب میں خوب دلچسپی لیتا ہے، مارکسی فلسفہ سے بہت واقف ہے، لسانیات اس کی سپیشلٹی ہے، میری اردو کی استری برابر کرتا ہے، گل بنگل زئی کے براہوئی پروف پڑھتا ہے، سنگت اکیڈمی میں روحِ رواں ہے، اور بہت پرائیویٹ ہو کر مذاق ومزاح سے محظوظ ہوتا ہے............

محظوظ کیا ہوتا ہوگا، حاضرین کو محظوظ بہت کرتا ہے۔ مثلاً ہمارے ایک خود ستا دوست نے اپنے لیے جب یہ مصرع پڑھا: "کچھ خار تم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم....." تو جاوید نے اسے بتایا کہ آپ یہ شعر نہ پڑھا کرو، شاعر نے تو بوٹ پہن رکھے تھے۔

خدا کا غضب، اس نے جمالیات پر کتاب لکھی۔

نا آشنا..........لگتا ہے، بلوچی میں بودلا، اور پنجابی میں جھلّا جیسا۔ وہ جب چاہے آپ کے خوب صورت ترین فقرے کو دو ٹکے کا بھی نہ سمجھے۔ اور جب چاہے آپ کی فضول ترین بات پہ

داد دے۔ محفل میں ہے تو کسی کی بات جاری ہوگی، اور ابھی آدھا فقرہ باقی ہوگا کہ جاوید اچک کر اُس کا فقرہ مکمل کر ڈالتا ہے ۔ بے چارہ اپنے آپ کی چونڈی کاٹ کر اپنے غصے کو بجھا دیتا ہے۔ عشق، محبت، حسن، اور ادا کے موضوعات اُس کے تئیں پبلک عنوانات ہیں ہی نہیں۔ ایسے ظاہر کرتا ہے جیسے حسنِ ماہ و ماہناز سے کبھی اس کا دل جلا ہی نہ ہو۔

جاوید اجتماعی کام پہ یقین رکھتا ہے ۔مگر خود حصہ کم لیتا ہے، ہدایات بہت دیتا ہے۔ ایسا کرو، ایسا کہو، یوں چلو۔ وہ واحد مخاطب صیغہ کو جمع متکلم کب بنائے گا، ابھی مجھے یہ دیکھنے مزید جینا ہوگا۔ وہ کبھی اچھا مقرر نہیں بن سکتا۔ سٹیج سیکریٹری تو بالکل نہیں۔

وہ مطالعے کا بڑا حامی اور عامل ہے۔ اس میں یہ کمال بھی موجود ہے کہ وہ ضخیم کتاب میں سے سرپٹ بھاگتے ہوئے گزرتا ہے، غیر ضروری حصے سونگھ کر ہی اپنا دامن تر کیے بغیر نکل جاتا ہے اور اس کے صرف ضروری کے بھی ضروری حصے ہی پڑھ لیتا ہے۔ ''تیز رفتار'' مطالعہ کار ہے جاوید۔

جاوید کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ کمال اعتماد کے ساتھ بڑے ادیبوں، دانش وروں، لیڈروں اور فلاسفروں سے دوستیاں گانٹھ لیتا ہے۔ چنانچہ اس کے پاس مرحومین کے بے شمار خطوط موجود ہیں۔ ان کی دستخط شدہ کتابیں ہیں اور مکان نمبر و گلی نمبر و فون نمبر ہیں۔

ٹراٹسکی اور سٹالن کی کُشتی کرانا اس کا پسندیدہ موضوع ہے۔ جس میں وہ ٹراٹسکی کو لتاڑتا ہے۔

ہمارے اس پڑھے لکھے ساتھی نے براہوئی زبان پہ بڑی تحقیق کی ہے۔ اس موضوع پہ اس کی پانچ کتابیں ہیں: براہوئی ادب کا نیا تناظر، براہوئی ادب کا سماجی پس منظر، براہوئی ادب میں مطالعے، براہوئی لسانیات، اور براہوئیات۔ مگر یہ موضوع چوں کہ بڑا مائع موضوع ہے، ہاتھ نہ آنے والا۔ نیز بلوچستان بہت تیز رفتاری سے تحقیق و تفتیش کا شکار ہے ۔ اس لیے ہر مہر گڑھ کی ہر دریافت جاوید کی تحقیق اور اس کے نتائج کو 180 درجے میں گھما ڈالتی ہیں۔ اب بجائے اُن

اور ہاں، جاوید نے دو کتابیں اور لکھیں: Marxist Approach to Literature اور Origin of Speech۔

لسانیات پر کام کرتے کرتے وہ اسلوب میں بالکل خشک ہو کر رہ گیا ہے۔ لالہ ہیتو رام والا منشیوں کا سٹائل، سکول ماسٹروں والا، خشک عرضی نویسوں والا چٹیل، اور، مترجموں والا مشینی سٹائل۔ آپ خواہ دوٹن لوبان جلائیں مگر اُس کے ہاتھ کو اس بات پہ قائل نہ کر سکیں گے کہ اُس میں تھاما ہوا قلم شرارت سے آپ کی طرف آنکھ مارے اور اپنی نوک سے کوئی مسکراتی بات نکالے۔

جاوید کی یادداشت بہت زبردست ہے۔ وہ شاید جی رہا ہے یادداشت کے سہارے۔ آپ کسی مضمون یا عنوان کے لیے حوالے ڈھونڈ رہے ہوں اور وہ کہیں سے نہیں مل رہے ہوں تو یہ جاوید کا زمبیل جیسا ذہن ہوگا جو آپ کی محتاجی دور کرے گا۔ وہ آپ کو اُس موضوع پر لکھے گئے مضامین اور کتابیں گنوادے گا، زبانی، جھٹ پٹ میں۔ اور یہ کوشش بھی کرے گا کہ مواد آپ کو مہیا بھی کردے۔

سخیاں زاموال بر می خورند
بخیلاں غمِ سیم وزر می خورند

ایک عالم کا اقتباس لیجیے: وہ علم جو آپ کو آپ کے حدود سے آگے نہیں لے جاتا، جہالت سے ہزار گنا بدتر ہوتا ہے۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ جاوید کی نظریاتی ٹرانسفارمیشن کب شروع ہوئی (مکمل تو اب تک نہیں ہوئی)۔ 80ء کی دہائی کے اوائل میں ہمارے دوست کو شاعری کا شوق چڑھ گیا۔ سانولا شخص جب رامش (چمک) تخلص رکھے تو تصور کیا جاسکتا ہے کہ کتنا شوق، کتنا اشتیاق تھا شاعری کا، عاشقی کا۔ (عاشقی مین میرا دعویٰ ہے کہ گھر پھونک ڈالے، بقول کشمیریوں ہری پوریوں کے، بس ''چان اَس'' ملے۔ بہر حال چمک تخلص والا یہ سانولا نوجوان شاعری کی اصلاح لینے ڈاکٹر خیال امروہوی کے پاس چلا گیا۔ اصلاح تو نہ ہوئی کہ اصلاح کرنے والے نہ اصلاح مقدر میں لکھی نہ تھی، البتہ صلاح مل گئی۔ استاد نے اسے مارکسزم کی طرف متوجہ کیا۔ کتابیں البتہ کوئٹہ سے ملیں: کمیونسٹ مینی فیسٹو، یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم، اساسِ لینن، خطوطِ لینن، خطوطِ لینن......

کوئٹہ میں اپنے آبائی حلقے یعنی ریلوے مزدوروں کے توسط سے سی آر اسلم کی سوشلسٹ

پارٹی میں بھرتی ہوگیا۔ ہم نے مشترکہ بزرگ بیعت لیے، اور وہیں ہماری ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ یہ سند یافتہ ''علمی'' آدمی بنا۔ جب کہ میں بے علموں میں تو علمی آدمی رہا مگر علم والوں میں قبائلی جانا جاتا رہا، نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا۔ پتہ نہیں لوگوں کو ڈھلمل ایمان والے قبائلی کیوں اچھے لگتے ہیں!! اُس نے ادب وزبان کے شعبے میں سپیشلائز کیے رکھنے کی راہ اپنالی، ہم ''ماسٹر آف نن'' ہی رہے۔ وہ نہ کرنٹ معاملات کی طرف گیا، نہ معاشیات سے چھیڑ خانی کی۔ زبان وادب کی بنیادی چوکھٹ کو مضبوطی سے تھامے رہا۔ وہ سی آر اسلم کی زندگی کی آخری سانسوں تک اس کا ساتھ دیتا رہا۔ اُس کے بعد حالات اور پارٹی دونوں نے کہا: ''یار، بندہ بن''۔ اور وہ بندہ بن گیا۔

غیر محفوظ معیشت وسکونت کا غم اس کی متوسط طبقاتی پن کو مرنے ہی نہیں دیتا، وگرنہ یہ شخص ہمارا اُسلوف ہوتا۔

مزاج اور مزاح کی بات برطرف، عجز کی حد تک منکسر المزاج جاوید اختر کا میری نظر میں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پچھلی صدی کی نوے کی دہائی اور موجودہ صدی کی پہلی دو دہائیاں بڑے ایمان اور ثابت قدمی سے جھیلیں۔ یہ بہت امتحان لینے والے تیس برس تھے۔ وہ زمانے جب سوویت یونین پرامن اور شانت اور لاپرواہ انداز میں اپنی جان لے چکا تھا، سوشلسٹ بلاک خود اپنی ہی فرمائش پر روئی کے گال بن کر تحلیل ہو چکا تھا۔ جیسے اُس کی کمپیوٹر میں پہلے ہی سے Autolyze موڈ ڈال دیا گیا تھا، جیسے فرانسیسی گلاسوں کی expiry ڈیٹ پوری ہوچکی ہو اور وہ باہر سے چھوئے بغیر ہی ریزہ ریزہ ہو کر فرش پر بکھرتے ہوں۔ ساری دنیا اپنی پارٹیوں جھنڈوں سے سرخی اتار کر ''مین سٹریم'' میں داخلہ کی جی حضوری کر رہی تھی مگر جاوید اپنے سوشلزم کے نظریے پہ قائم ودائم رہا۔ (اپنے آپ سے، باہر کی بے خبر دنیا کو کیا بتایا جائے کہ میں سوشلسٹ ہوں، نہیں ہوں)۔

''...... وفا جمالیات ہوتی ہے اور سائنسی نظریہ سے وفا تو جمالیات کی لطیف ترین صورت!۔''

یہ شخص مرے تو وفا کی ملکہ سسی اور وفا کے پیکر پنوں کی زیارت گاہ کے قریب گاڑے جانے کا حق دار ٹھہرے۔ اُس کے استاد کو سلام!

میرے خدا مجھے لاکھوں میں چھانٹ کے دے دے
وہ چند لوگ جو کانٹوں پہ ساتھ چلتے ہیں
(او یار، چلے نہ چلے، کم از کم کہے تو یہی)۔

''لینن اور جمالیات'' نامی اُس کی ایک تحقیقی کتاب لٹریچر اور آرٹ کے بارے میں ہے، اُن کے مطالعہ کے بارے میں ہے، ادیب اور آرٹسٹ کے بارے میں ہے۔ اس موضوع پر دیگر زبانوں میں تو اچھا خاصا مواد موجود ہے۔ مگر اردو میں کوئی جامع اور الگ سے لکھی گئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ اس اہمیت کے اعتبار سے ایک ایسی کتاب بہت ضروری ہوگئی تھی۔

بہ ظاہر اس کتاب کا نام محض دو لفظوں پر مشتمل ہے: ''لینن'' اور ''جمالیات''۔ مگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انھی دو الفاظ نے تو دنیا کا، متھا گھما کر رکھ دیا ہے۔

حُسن قرنوں سے ایک الجھا ہوا موضوع رہا ہے۔ انفرادی حسن سے لے کر سماجی حسن تک ہمیں بے شمار قربان ہوئی ہوئی زندگیاں ملتی ہیں۔ رابعہ خضداری، سسی، مست، اشرف دہقانی،............ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ اگر ہم بڑے کینوس کی بات کریں تو مجھے لگتا ہے کہ سچائی ہی حسن ہے، اُسے ڈھونڈنا، ڈھونڈ کر ستھرا کر دینا، اور پھر اس انجن کی ٹینکی کو امید نامی پٹرول سے بھر کر دنیا میں رواں کر دینا ہی تو اعلیٰ ترین حسن ہے۔ خیر وشر کے جاری مناقشے میں خیر کا ساتھ دینے کا فیصلہ ہی سب سے بڑی جمالیاتی قدر ہے، اور اس کے پسِ پشت ماضی کا ذہنی سفر اور مستقبل کی خوش آئندگی ہے۔

پھر لینن کو لیجیے۔ لکھتے لکھتے، بولتے بولتے، تنظیم سازی کرتے کرتے، جدوجہدیں کرتے کرتے اس نے وہ جمالیاتی کام بھی کر ڈالا، جسے اکتوبر انقلاب کہتے ہیں۔ ایک عوامی انقلابِ سے بڑا جمالیاتی وقوع اور کیا ہوسکتا ہے۔

...... آج بھی سرمایہ داری نظام کی مخالفت اور سماجی انصاف پہ مبنی نظام کے قیام کی کوششیں کرنے سے بڑی جمالیات نہیں ہوسکتی۔

مارکس اور اینگلز کے نامکمل کردہ گوشوں میں رنگ بھر دیے۔ اس نے تو، لینن نے کس

موضوع پہ نہیں لکھا؟۔ادب تو بالخصوص اُس کا پسندیدہ شعبہ تھا۔اس نے تو ادب،فن اور تنقید کے چوکھاٹ متعین کر دیے۔فطرت کی ہارمنی کو سمجھنے،اسے قائم اور برقرار رکھنے میں لینن سے شاید ہی کوئی بڑا مزدور رہا ہے۔اس نے کوئی مجرد بات کبھی نہ کی۔وہ ہر بات کو اس کے پس منظر میں دیکھتا تھا،اُس کے ماحول کو تلاش کر کے اُس کی اصلیت بتاتا۔یہی خصوصیت'(یعنی معاملات کو اُن کے سماجی پس منظر میں دیکھنا)جمالیات ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ آرٹ و ادب خواہ کوئی بھی تخلیق کر رہا ہے،تاریخ میں اس پہ مجموعی قبضہ زرداروں کا رہا ہے،عوام کا نہیں۔وہی زردار انہیں اپنے مفادات کے لیے اچھے برے ہر طریقے سے استعمال کرتا رہا ہے۔وہی آرٹ و ادب میں نئے نئے پراسرار نظریات داخل کرواتا رہتا ہے۔وہ اِس پراسراریت کو بڑے بڑے ہوٹلوں میں،بڑے کروفر اور پھوں پھاں کے ساتھ قابلِ قبول بنانے میں لگا رہتا ہے۔سرمایہ چاہتا ہے کہ ادب کو عوام سے دور رکھا جائے اور اسے محض مزے لینے کی چیز بنایا جائے۔مگر لینن اور اس کی فکر سے وابستہ لوگوں کے لیے ادب،فلم اور آرٹ محض تفریح نہیں ہوتے۔چسکا اور لذت نہیں ہوتے۔فن اور ادب تو بہت سارے مشقت طلب پراسیسوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔اور قاری کے پاس آ کر بہت سے نئے پراسیسوں کو ابھارنے کا سبب بنتے ہیں۔

لینن عوام کا ترجمان تھا۔وہ ہر نعمت عوام کی خدمت کے لیے عام کر دیتا تھا۔ادب و آرٹ بھی نعمتیں ہیں۔لینن کی نظر میں ادب محنت کرنے والے عوام الناس کی انقلابی تربیت وطبقاتی شعور کی خدمت کے لیے ہے،نہ کہ دائمی بدہضمی کا شکار بڑے پیٹوں والوں کے لیے۔لینن نے یورپ کے تقریباً ہر ادیب وشاعر کا مطالعہ کیا اور اپنی تحریروں تقریروں میں حوالے دیے۔سابقہ بھی اور ہم عصر بھی۔اندازہ ہوا کہ مزدور تحریک سے وابستگان کو ادب اور آرٹ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ لیڈر سے لے کر،ورکر تک۔

جاوید کی زیرِ نظر کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہے:''لینن اور مارکسی تنقید''۔...........
اس باب کے صرف پیر ہی بھاری نہیں ہیں،اس کا تو پیٹ،دھڑ اور سر بھی بھاری ہیں۔ماسٹروں جیسی

تحریر۔قاری کو ساتھ لے کر جانے کے بجائے وہ اپنے دشتِ لوط جیسے طویل فقروں کے سبب اُس سے دو سو گز آگے آگے چلتا ہے۔اور وہاں بھی وہ موٹے موٹے مشکل الفاظ کو پتھر بنا بنا کر قاری کو مارتا رہتا ہے۔گویا چاہتا ہے کہ کوئی من موجی ہیوتان کے اونٹوں کے گلے میں آن شامل نہ ہو۔الفاظ دیکھیے،پتھر دیکھیے:ارتجالی،مہیجات،استمراری،مملو،ازواق،امیال،ادراکی معمول،سلسلۂ تعامل، مستدیرہ،متبائن۔یہ تو قاری کو بھگانے کا Mospel لوشن ہیں۔لگتا ہے وہ کسی یورپی زبان کے لمبے لمبے فقرے ترجمہ کر رہا ہو،انتہائی غیر ضروری اور موضوع سے کوسوں دور پیراگرافوں کے پیراگراف جبراً شامل کر دیے گئے۔انجانے اور غیر ضروری کرداروں،انجانے واقعات اور انجانی کتابوں سے بھرا باب۔گویا کتاب نہیں بلوچستان کی حکومت ہو۔کتنا اچھا مواد ہے مگر کس قدر کرخت و درشت و طویل و بیزار کن اظہاری صورت ہے؟۔جاوید اختر بہتے میٹھے دریا کنارے اپنے مشکیزے کی ضرورت کا اندازہ بالکل نہیں کر پاتا،اُس کا مشک پھول کر پھٹ جاتا ہے مگر مالک کو خیال نہیں رہتا۔کٹورے بھر بھر ڈالتا رہتا ہے۔قدح،در قدح،در...........ہم اس سے لڑے،وہ مواد سے لڑا،مگر نزودا کے برعکس اس سے صرف بھدے،مسترد کردہ اور متروک الفاظ ہی راضی بہ رضا نہ رہے۔

کتاب کا دوسرا باب''لینن اور فنونِ لطیفہ'' مجھے اچھا لگا۔ایک تو موضوع عام فہم ہے،یعنی میری سمجھ میں آسکتا ہے،اور دوسرا لگتا ہے کہ یہاں مصنف اپنے ستار کے سُر اور تار برابر کر چکا ہے۔ البتہ ایک آدھ گستاخ و بے آرام بچہ تو ہوتا ہی ہے کلاس روم میں۔مثلاً:بالاستعیاب،ایجاز، متغائر،مہیجات،مقولات ومعقولات،ادراکات،تفہیمات۔

سچی بات یہ ہے کہ جاوید اختر نے اس باب کو مشکل اور خشک بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر موضوع کی منہ زوری اور من چلاپن اس قدر زور نکلا کہ اُسے ہی ملائمت و قبولیت کا لہجہ اختیار کرنا پڑا۔یہاں بھی لینن پہ بات کرتے کرتے اس کے قلم کا ریل انجن بے قابو ہو جاتا ہے اور وہ بالزاک وغیرہ کے جہنم لائن میں تین چار صفحہ تک چلتا جاتا ہے۔

جاوید اختر نے آرٹ کے بارے میں لینن کے شوق ذوق کا اچھا خاص کھوج لگایا۔لینن

نہ صرف فکشن پڑھتا تھا بلکہ جذب جذب کر پڑھتا تھا: مقامی، ملکی، غیر ملکی، سارا۔ اسی طرح اُسے موسیقی سننے کا بہت شوق تھا۔ فلم اور تھیٹر میں بچوں کی طرح محو ہو جاتا، محظوظ ہوتا اور اس کے بعد خوب خوب تبصرہ کرتا۔ لینن سادہ فقرے پسند کرتا ہے، چھوٹے عام فہم فقرے۔ تصنع اُسے ناگوار ہوتا تھا۔ سرمایہ داری کی تعریف وحمایت تو ویسے ہی اُسے زہر لگتا تھا، اُسے تو مظلوم کی حالت اور اس کی مزاحمت میں بھی مبالغہ، بہت برا لگتا تھا۔ وہ چالاک دانش وروں پر قلم کے تلوار نکالتا تھا جب وہ کسی نکتے کو ابہام کی وادی میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوں۔ دوٹوک، واضح بات ہی انقلابی کی صفت ہوتی ہے۔ اور ایسی بات جو عوام الناس سے متعلق ہو۔ لینن دایاں بایاں، اپنا پرایا، ہر لکھاری وآرٹسٹ کا بلا رورعایت تجزیہ کرتا تھا۔ اور موصوف میں انقلابیت، قدامت ورجعت یا پیٹی بورژوا رجحان الگ کرتا جاتا۔ لینن نہ تو تحریر وآرٹ میں حقائق کو مسخ دیکھنا گوارا کرتا ہے اور نہ ہی لاشوں کی مسخ کنی اسے برداشت تھی۔

یہ لینن ہی نے بتایا تھا کہ آرٹ، رواج اور عوامی عادات وخصائل سماجی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بالکل نہیں چلتیں۔ بلکہ یہ ڈیزل انجن کی طرح نرم رفتار، بھدی بھینس کی طرح ہانپتی کانپتی، اور شکاری گزیدہ پہاڑی دنبوں کی طرح پھونک پھونک کر چلتی ہیں، اور ہمیشہ سماجی تبدیلی کے پیچھے پیچھے آتی ہیں۔ سماجی تبدیلی آگے آگے ادبی تبدیلی بہت پیچھے،.........البتہ انفرادی طور پر تو کچھ ادیب سماجی تبدیلی کا ساتھ کیا، اُس کی راہنمائی میں آگے آگے ہوتے ہیں۔

لینن کی دنیا میں ذہن ہی خیالات کا ویئر ہاؤس ہے، ذہن ہی فیکٹری اور ذہن ہی براڈ کاسٹر ہے۔ اس لیے ہمارے مشرق میں ''آمد وآورد'' کی بحث فضول ہے۔ بھئی یہ آمد کیا بلا ہوتی ہے۔ خیالات تو اپنے اردگرد سے ہی جنم لیتے ہیں، ذہن میں پراسیس ہوتے ہیں اور ذہنی احکامات کے تحت ہی بولے، لکھے یا پینٹ کیے جاتے ہیں۔ سب ''آورد'' ہے، ''آمد'' کا کہہ کہہ کر شاعری اور آرٹ سے عوام الناس کو دور رکھنا مقصود ہوتا ہے۔

جاوید نے اپنی کتاب کے تیسرے باب کو ''لینن اور ادبی کردار'' کا عنوان دیا ہے۔ یہ بہت ہی ٹیکنیکل ساعنوان ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس عنوان پہ تو ایک آدھ صفحہ تک لکھنا مشکل ہے، مگر

جاوید اختر نے سینتیس صفحے بنا لیے ہیں۔ اس نے پہلے تو کردار نگاری کی اہمیت پہ کافی سطریں لکھیں۔ اُن کے باہمی اور عمومی طور پر ناول کے ساتھ تعلق کے جدلیاتی پن پہ لکھا۔ اس باب میں بھی اُس نے مختلف ناولوں افسانوں کا بہت تفصیلی تذکرہ کیا۔ اُن کے مصنفوں کی سوانح کو مارا، پیٹا، کوسا۔

یہ بیان پچھلے ابواب کی طرح سینڈک کی ریت جیسا خشک تو نہیں مگر لمبا چوڑا بہت ہے۔ ایسے بہت سارے مصنفین کے تذکرے ہیں جن کی تخلیقات شاید ہی کسی نے پڑھی ہوں۔ اس لیے صرف لینن سے محبت اور دلچسپی کی وجہ سے تفہیم کے پیٹ پر پتھر باندھ کر اس باب کو پڑھنا پڑتا ہے۔

''لینن اور رومانویت پسندی'' بھی مختلف ادیبوں کی مثالوں سے مزین باب ہے۔ البتہ، یہاں زور دیا گیا کہ تخلیق کے لیے خواب وخیال کی موجودگی اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی کہ خارجی معروض ضروری ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مباحثہ چلانا یہاں برصغیر میں بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں گذشتہ ایک صدی تک ''معروضی سیاسی سماجی ومعاشی ماحول'' پہ اتنا زور دیا گیا کہ حِس، حسی آلات، اور دماغ کو بس ڈاکخانہ سا سمجھا جانے لگا۔ اس لیے اب جاوید اور اُس کے ساتھیوں کو اس کا کفارہ ادا کرتے رہنا پڑے گا۔ خواب، خیال، تخیل، ادراک، احساسات اور فنی مہارت پر جتنا زور دیا جائے گا معروضی حقائق واثرات اُسی قدر خوبصورتی سے بیان کیے جاسکیں گے۔ معروض کو گولی تو نہیں مارا جاسکتا مگر صرف اسی کے سامنے چینی عوام کی طرف سے بادشاہ کو سجدہ کرتے رہنا بھی بہت ناروا ہے۔ لہٰذا معروض کے ساتھ رہتے ہوئے اور بہ یک وقت اُس سے لڑتے ہوئے۔ انقلاب اور انسانی بہبود کے بارے میں خواب دیکھنا، سوچنا افضل ترین خصلت ہوتی ہے۔ پیرزادہ قاسم کا کیا خوبصورت شعر ہے:

میں ایسے لوگوں کو زندوں میں کیوں شمار کروں
جو سوچتے بھی نہیں خواب دیکھتے بھی نہیں

گبریل گارشیا مارکویز تو کہتا ہے کہ ''یہ صحیح نہیں ہے کہ لوگ خواب اس لیے نہیں دیکھتے

کہ وہ بوڑھے ہو رہے ہوتے ہیں، وہ بوڑھے ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ خواب دیکھنا روک دیتے ہیں''۔

لینن تو خوابوں کا سمندر تھا۔ تخیل کا ہول ٹائمر۔ وہ نہ صرف خود خواب دیکھتا تھا بلکہ پورے بنی نوع انسان کو خواب دیکھنے پر اکساتا رہتا تھا، فرمائش کرتا تھا۔

لینن کے سارے پیروکار رومانٹسزم کی حد تک خواب دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ خود اس پر ایچ جی ویلز نے Dreamer of Kremlin کا نام رکھ دیا تھا۔

مگر لینن کے ساتھی محلات و دربار کے بجائے جیلوں، جلاوطنیوں، اور پھانسی گھاٹوں پر خواب گری کرتے رہے ہیں۔ وہ انسانوں کو ایک کرنے کا، نیک کرنے کا خواب دیکھتے ہیں۔ تنگ نظری والے خواب ہمیشہ بشر دشمن دیکھا کرتا ہے۔

اور خواب فرسودہ کبھی نہیں رہتے۔ خواب ارتقا کرتے رہتے ہیں..........

اور مزیدار مزیدار، جمالیات سے پُر اور خوشگوار تر خواب دیکھنے کے لیے مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لینن خوب پڑھتا تھا۔ وہ ادب پڑھتا تھا، اپنا ملکی ادب، بین الاقوامی ادب۔ خود پڑھنے اور خواب بُننے اور دوسروں کو پڑھنے اور خواب بُننے پر لگا دینے والا انسان' انسانیت کی بہت خدمت کرتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ لینن نے ماضی کے خوابوں کو مسترد کبھی نہ کیا البتہ اُن کی پرستش کو مسترد کیا۔ مستقبلیات کے اس کمانڈر نے ماضی کے رد کرنے کو رد کیا۔

لینن ادب کو انتہائی سنجیدہ لیتا تھا۔ اور اس کا مطالعہ کبھی سرسری نہ تھا۔ اور وہ انتہائی باریک بینی اور گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اُسے یاد بھی رکھتا تھا اور پھر خود اپنی تحریروں میں اِن کرداروں کو استعمال کرتا تھا۔ اور الفاظ و کرداروں کا استعمال لینن کے ہاں عام و معمولی قطعاً نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے نظریاتی، سیاسی یا تنظیمی مخالفین کو یہ کردار ٹکا کے، شست باندھ کر دے مارتا ہے۔ اور کبھی بھی ایسا نہ ہوا کہ جس کو یہ کردار و الفاظ لگے ہوں اور اس کی آنکھ نہ پھوٹی ہو یا گھٹنا نہ ٹوٹا ہو۔

جاوید صاحب اس باب کے لیے کتابوں رسالوں سے 62 حوالے لاتا ہے۔

''لینن اور ثقافتی انقلاب'' ایک بہت ہی پھیلا ہوا عنوان ہے۔ اس پہ بہت کچھ لکھا اور کہا

جا سکتا ہے۔ مجھے اس باب میں اگر کئی جگہ غیر ضروری پن کا احساس ہوا تو کہیں کہیں تشنگی کا بھی اجنبیت قاری کے سر پہ یہاں بھی ہتھوڑے مارتی ہے۔ جو گرم لباس یورپی قارئین گرمیوں میں بھی پہنتے ہیں وہ ہم سبی ڈویژن والوں کو سردیوں میں بھی مار دیتا ہے۔

لینن اپنی زندگی کے آخری نصف میں جن موضوعات، بحثوں، رجحانات اور تنظیموں سے دوچار رہا، جاوید نے اُن پر توجہ کی۔ اس قدر قیمتی مواد پہ یقیناً اگلے ایڈیشن میں وہ نہ صرف محنت کرے گا بلکہ اصل اور پیوندکاری کے جدلیاتی رشتے کے ساتھ انصاف بھی کرے گا۔

اپنی کتاب میں جاوید نے اگلا پورا باب ''لینن اور چرنی شوفسکی'' پر لکھا۔ فارسی میں ترجمہ شدہ ''پس چہ باید کرد'' نامی ایک زبردست ناول ماما عبداللہ جان کے ہتھے چڑھ گیا تو اُسے پڑھنے کے بعد وہ اس کی زبردست تعریفیں کرنے لگا۔ اُس کے انگریزی ایڈیشن کی فرمائشیں شروع کیں۔ ہمیں بس اتنا پتہ تھا کہ یہ لینن کا پسندیدہ ترین ناول تھا۔ مگر ہمیں انٹرنیٹ سے چرنی شوفسکی کا یہ مشہورِ عالم ناول اس وقت ملا جب عبداللہ جان کی ضعیف العمری نے اُسے پڑھنے کے قابل نہ چھوڑا۔ لہٰذا میں اور جاوید صاحب نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ ہم بہت عرصے تک ہر شام اپنے اپنے پڑھے ہوئے حصے پر باتیں کرتے رہے۔ اس قدر اکتا دینے والا، بے کیف چھپائی والا ناول میرے مزاج کا تو ساتھ نہ دے سکا البتہ جاوید نے اسے پورا (?) پڑھ لیا۔ اور اس پہ لکھا:

یہ کہ لینن نے اُس کی تحریریں بہت غور سے پڑھ رکھی تھیں، یہ کہ دونوں میں کئی باتیں مشترک تھیں، یہ کہ چرنی شوفسکی لینن کے پھانسی شدہ انقلابی بھائی (الیگزنڈر) کا بھی پسندیدہ لکھاری تھا، یہ کہ لینن زندگی بھر اپنی تحریروں تقریروں میں چرنی شوفسکی کا تذکرہ بہت جوش سے کرتا رہا، یہ کہ حکومت سنبھالنے کے بعد بھی کریملن میں لینن کے پاس اینگلز کی کتابوں کے ساتھ چرنی شوفسکی کی تصانیف کا مکمل مجموعہ بھی تھا۔ یہ کہ لینن کا دعویٰ تھا کہ اس کے نظریے کو مکمل طور پر تبدیل چرنی شوفسکی کے مطالعہ نے کیا تھا.......... اور یہ کہ لینن' چرنی شوفسکی کو پڑھ کر مارکس کی جانب راغب ہوا۔ آگے جاوید صاحب نے چرنی شوفسکی کے فن اور طرزِ تحریر پہ لکھا۔

اس کتاب کا اگلا باب ''لینن اور لیو ٹالسٹائی'' کے نام کا ہے۔ ٹالسٹائی تو ہم سب کا پسند

یدہ و نازنین ناول نگار رہے۔کون ہے جو اُس کے ''واک تھرو گیٹ'' سے گزرے بنا ادب دوستی کا دعوی کرسکتا ہے۔ایک ایسا یوٹو پیائی نواب جس نے انقلاب سے گزرے بغیر، شدید و متشدد جدو جہد کیے بغیر محض مثال ونظیر کے ذریعے لوگوں کو اچھا بنانا چاہا۔ٹالسٹائی واقعتاً کسانوں کا نمائندہ ادیب تھا، انقلاب کے بجائے اخلاقیات کا علم بردار ناولسٹ !!۔ جاوید صاحب نے اُس کی ہر کتاب کا حوالہ دیا۔اُس کے زمانے کا بتایا اور لینن کی پسندیدگی کا بتایا۔اس پورے باب میں بلوچ قاری (جو پاکستان میں قارئین کی بڑی فیصدی بناتے ہیں) کے لیے انطباق ، فی الجملہ ،مبتذل ،صوبجات ، پاجی پن ،طربیہ اِنسانی ،اورعسرت ، جیسے الفاظ اس کے پڑھنے کے تسلسل میں اڑنگیاں پیدا کرتے ہیں۔

''لینن اور گورکی'' بھی عمدہ باب ہے ۔ہم سب گورکی کو،اور بالخصوص اس کے ناول ''ماں'' کو پڑھ کر انقلابی راہ میں ''غوں غوں'' کرنے کے قابل ہوئے ۔صدقہِ جاریہ دیکھیے کہ 19 ویں صدی کا لینن بھی اُس سے اثر لیتا تھا اور آج اکیسویں صدی کا مندو منجھرا کا انسان بھی۔صاف، ستھرا اور متعین نظریہ۔کوئی کنفیوژن نہیں،کوئی یوٹو پیائیت نہیں۔ ناترس حقائق کو جمالیاتی انداز سے بیان کرنے والا ناول نگار۔

جاوید یہاں بھی ادیبوں شاعروں کا جمعہ بازار لگا دیتا ہے مگر یہاں گورکی کی اپنی زوردار شخصیت ہماری نجات کو آجاتی ہے اور طوالت و حاشیہ آرائی سے ہمیں بچالیتی ہے ۔مگر یہی گورکی ہمیں ایک اور طریقے سے طوالت میں گرفتار کرواتا ہے ۔ جاوید گورکی کی پوری سوانح حیات لکھ مارتا ہے،اس کی کتابوں کے بارے میں بات کرتا ہے،اس کے فن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے ....اور پھر کہیں جا کر لینن سے گورکی کی دوستی اور قدردانی تک پہنچ پاتا ہے۔..........اور اُس وقت تک باب کا اختتام بھی ہو جاتا ہے۔آپ یقین کریں 24 صفحات اور 52 حوالہ جات پر مشتمل ب وبصورت عنوان والے مضمون میں آپ ایک جگہ بھی ذہن کی پیشانی کی شکنیں ڈھیلی نہیں کر پائیں گے۔ارے بھئی گورکی اور لینن کا تذکرہ ہو تو کتنی دلچسپی پیدا ہوتی ہوگی۔ صرف اُس کا کردار'' کا مو'' ہی آپ کو مزے مزے سے پڑھنے پر مجبور کرے گا۔

زبان، ادب اور کلچر کے سلسلے میں لوناچرسکی بین الاقوامی سطح کا ایک دانش ورومدبر تھا۔ جاوید اختر کی کتاب میں ''لینن اور لوناچرسکی'' نامی نسبتاً مختصر باب میں ان دونوں کی باہمی بحث مباحثوں، مشاورت اور اتفاق واختلاف کے بارے میں مفصل بتایا۔

لوناچرسکی اپنی زبردست صلاحیتوں اور محنتی فطرت کی وجہ سے ہمیشہ لینن کا منظورِ نظر رہا۔ وہ کبھی کبھی فن وثقافت وجمالیات کی موجوں میں بہہ بھی جاتا تھا اور فتویٰ زدگی کی حد تک دائیں بائیں سکیٹنگ بھی کر جاتا تھا۔مگر عظیم صلاحیتوں سے بھرے اس خوش قسمت انسان کو لینن کی رہنمائی ملی اور وہ انسانی نجات وفلاح کے عمومی کارواں میں ہی رہ پایا۔تقدیر نے یہی سہولت میکسم گورکی اور رومینرولاں کو بھی عطا کردی۔گورکی ،لوناچرسکی اور رولاں ادب اور ثقافت کا دیدہ بند (ٹانگے کے گھوڑے کی آنکھوں پر بندھی چمڑے کی پٹی) پہنتے تو انقلابیوں کو یک طرفہ طور پر دست بردار ہو کر انقلاب سے ہی دست بردار ہونے کی فرمائشیں کرتے ۔بعد از انقلاب لینن نے لوناچرسکی کو جائز طور پر ثقافت وفن وتعلیم کا وزیر بنالیا۔جاوید اختر نے اس کتاب میں لوناچرسکی کے کچھ ڈراموں کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔کاش وہ اِن میں سے چیدہ چیدہ ڈراموں کو منظم ومربوط طور پر ترجمہ کردے۔

اس کتاب کا آخری باب ''لینن اور معاصر غیر ملکی دانش ور'' کے عنوان سے ہے۔ یہ جو لینن تھا ناں، یہ غیر معمولی انسان تھا۔ 54 جلدوں کی تصانیف اس نے لکھیں ، انقلاب کے لیے پارٹی اس نے منظم کی ، انقلاب کے لیے جنگ اس نے کی ، انقلاب وہ لایا اور اسے نصف درجن سالوں تک کامیابی سے چلایا، پوری انسانیت کی راہنمائی کی...........اور ان سب کے باوجود اس نے ادیبوں شاعروں فلاسفروں ،فن کاروں اور ثقافتی شخصیات سے ذاتی دوستیاں بھی رکھیں اور کر کے نبھائیں بھی۔وہ نہ صرف اِن لوگوں کی تخلیقات کا مطالعہ وملاحظہ کرتا تھا بلکہ اُن کی تخلیقات پر بروقت سائنسی تجزیہ بھی کرتا تھا۔

جاوید نے اس موضوع کو چھیڑا تو ہے مگر اُس طرح کی محفل نہ جمائی جو اس موضوع کا تقاضا ونشا تھا۔اس نے نسبتاً نامانوس لوگوں کی بات زیادہ کی جو یہاں کے قاری کی دلچسپی کو بڑھاتے نہیں،

گھٹاتے ہیں۔اگر وہ ذرا زیادہ وقت لگا تا تو یہ باب شاید کتاب کا اہم اور دلچسپ ترین باب ہوتا۔

مصنف نے حوالہ جات کے سلسلے میں اچھی خاصی ذمہ داری سے کام لیا ہے۔مگر، کہیں کہیں حوالہ جات کو ایسا تشریحی نوٹ بنا دیا کہ وہی حصہ زیادہ طویل ہو جاتا ہے۔اور بذاتِ خود ایک جوابِ مضمون بن جاتا ہے۔

قصہ کوتاہ یہ کہ، موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب بہت برمحل ہے اور اس کی اشد ضرورت تھی۔دیکھیے ناں! سوچنے، پڑھنے اور لکھنے والوں کی ایک نئی نسل جوان ہو چکی ہے۔وہ بھی ایسے میں جب ادب وفن میں حقیقت پسندی اور جمالیات کے جدلیاتی تعلق کے بارے میں بہت کم بات ہوتی ہے۔سرمایہ نے نظریات پر دھند و کنفیوژن کی ایک موٹی تہہ بچھا دی ہے۔ادب میں جدید وقدیم، آئیڈیلزم ومعروضیت، اوہام واجداد پرستی اور میٹریلزم، پھکڑ پن اور جمالیات جیسے نظریات کے مناقشے ختم کر دیے گئے ہیں۔ادبی جمعداریوں ٹھیکیداریوں کو فروغ دیا جا چکا ہے۔اور سائنسی فکر کو مدہم بنا دیا گیا ہے............اور یہیں تو تہذیب کی موت ہوتی ہے۔جاوید نے طبقات، طبقاتی سوچ اور طبقاتی ادب کے تصور کو دوبارہ چھیڑ کر تہذیب کی فوتگی کے فتوؤں سے انکار کیا ہے......ہم سب اُس کے اِس مقدس انکار کے ساتھی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ کتاب چھپنے کے بعد میں اور آپ مل کر اپنے دوست کو قائل کریں گے کہ وہ اس اہم اور بنیادی کتاب کے اگلے ایڈیشن کو مزید بے ساختہ اور رواں بنانے پر محنت کرے تاکہ تصنیف پر ترجمے کا گماں نہ ہو۔

پروفیسر جاوید اختر دائیں بائیں ترغیبات، الجھنوں اڑچنوں اور الجھنے سے بچ بچا کر چلتا رہا ہے۔ایم فل انگریزی لٹریچر میں کرنے والا یہ چھوٹے قد کا نیم گنجی عمر کا نوجوان اب انٹرنیشنل رسالوں، پبلشروں کے ہاں چھپنے لگا ہے۔یورو اور ڈالروں کو اپنی طرف راغب کرتا ہوا۔وہ کبھی شیکسپیئر کا کسی سے مقابلہ کرا رہا ہے، کبھی گوڈو کے انتظار کو جدید اردگرد میں ڈھالتا جاتا ہے۔

اطمینان کی بات ہے کہ اُس کے نامعلوم سپاہیوں کا لشکر اپنی روانی برقرار رکھے ہوئے ہے۔

کسنڈرا بالچن

لاہور میں صفاں والا چوک پر ٹمپل روڈ پہ واقع سی آر اسلم کا گھر بہت سی باتوں میں میری تربیت گاہ رہا۔مطالعہ کیا ہے اور اسے کس طرح کیا جائے، لکھنا کس مقصد اور طرز پہ ہو، بحثیں کیسی ہوں، تنظیم کاری کیوں کر ہو............ہم نے میز کرسی لگے دفتر نما گھر کے کمرے میں بغیر سرٹیفکیٹ وسند کی اس یونیورسٹی سے بہت کچھ پڑھا، لکھا اور سیکھا۔

یہیں پر اُس کے جڑواں بیٹوں قیس وسفیان سے ملاقات ہوئی۔سفیان شادی شدہ اور بچوں والا تھا۔کوئی بہت زیادہ ہنس مکھ تو نہیں مگر سنگین ومتین اور رکھ رکھاؤ والا۔جب کہ قیس چنیدہ چنیدہ لوگوں سے گھل ملنے والا شخص ہے۔وہ اُس زمانے میں ایک بہت ہی اَپر کلاس کے انگریزی سکول میں پڑھاتا تھا۔'باقاعدہ' شادی شدہ نہ تھا۔کھلا ڈلا آدمی، شادی وادی کو بہت سنجیدہ نہ لینے والا جوان۔سکول میں اپنی ہم کار انگریز استانیوں کو اپنے عالم ومشہور والد سے ملوانے لاتا رہتا تھا۔کسنڈرا بالچن انھی میں سے ایک تھی۔قیس سے قربت اس قدر کہ شادی نہ شادی کا پتہ نہ چلتا تھا۔شادی کے بغیر شادی۔اور بغیر شادی کے شادی۔پھر بہت وقت کے بعد انھوں نے باقاعدہ شادی کر لی۔

میں اپنے دوسرے ہم سنوں کی طرح انگریزوں سے کچھ زیادہ ہم کلام نہ ہوا تھا۔بالخصوص انگریز (یورپی) عورتوں کے بارے میں کتابوں فلموں کے علاوہ کچھ بھی نہ جانتا تھا۔لہٰذا اِس خاتون کو بھی ذرا فاصلے سے دوست ہونے کی وجہ سے تکریم کرتا رہا۔

کسنڈرا ہم انقلاب زدگان کی عزت وتوقیر کیا کرتی تھی۔وہ اندر دل کی گہرائیوں میں

کسی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔شاید مشینی یورپ میں کسی ’انسانستان‘ کو نہ جانتی تھی۔ چنانچہ قیس کے ساتھ دوستی اور کشش کے ساتھ سی آر اسلم کے ساتھ بھی زیادہ وقت گزارتی تھی۔ اور سی آر کی محفل میں تو ’’بات‘‘ ہوتی تھی۔فلسفہ پہ، سیاست پہ، معیشت پہ، نظریہ پہ کتابوں فلموں ڈراموں اور کلچر پہ۔ یوں، ہم دوست بن گئے، اور اس طرح میں نے پہلی دفعہ انگریز عورت کو قریب سے دیکھا۔

محترمہ ایلس فیض سے میری شناسائی تھی مگر جیسے زندگی بھر میرا وطیرہ رہا، یہ شناسائی یک طرفہ تھی.......... دیوتا کی بیوی سے آپ ایک ہی طرح کا رویہ رکھیں گے: عزت کا، عقیدت کا۔ پھر مجھے تو شروع سے کوئی بڑھ بڑھ کے واقفیت پیدا نہ کرنے کی بیماری تھی، جھپٹ لپک کر فوٹو نہ کچھوانے کی تربیت۔ لہٰذا دوستی تو صرف ایک انگریز عورت سے تھی: کسنڈرا بالچن سے۔

دانش ور، دانش ورسی، متجسس نظر و ذہن کی ....شکل وصورت میں تو انگریز مگر سادہ اتنی، بے ساختگی اس قدر، اور دوغلا پن سے اس قدر دوری کہ بلوچ لگتی تھی۔ بے چاری کو، اپنی یورپی کلچر اور بالائی درمیانہ طبقے کی پنجابی کلچر کو جوڑنا سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اِدھر بلوچ پس منظر میں ڈوبے مری ماما کی باتیں تو اُسے چکرا دیتی تھیں۔ اپنے کلچر اور روایات سے میرا ذہن اس قدر لپیٹا ہوا تھا کہ اُسے کبھی کبھی یہ ذہنی پسماندگی لگتا تھا۔ ہنستے ہوئے ایک بار ہاتھ کے اشارے سے میری کسی بات کو مسترد کرتے ہوئے اس نے مجھے sexist کہا تو میرے لیے یہ لفظ ہی نیا تھا، اس لیے ڈکشنری دیکھے بغیر اس کے الزام کا جواب کیسے دیتا۔ قیس سمجھ گیا کہ بلوچ بھائی sexist لفظ کو جنس یا جنسی عمل سمجھ رہا ہے۔ اس نے میری تلملاہٹ بروقت محسوس محسوس کی اور مسئلہ حل کر دیا۔ مجھے سمجھایا کہ Sexist کا مطلب ’’جنسی جنونی‘‘ نہیں بلکہ ’’جنس کی بنیاد پر امتیاز کرنے والا‘‘ ہے۔ اور اُسے سمجھایا کہ یہ شخص اپنی ثقافت کی زبان بول رہا ہے۔ اس کا انقلاب اپنی سرزمین پہ پاؤں رکھے کھڑا ہے، اور ذاتی طور پر یہ جنسی امتیاز والا نہیں ہے۔

انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں کوئی سیمینار وغیرہ تھا۔ واپسی پہ میں باہر رکشہ لینے جا رہا تھا کہ پیچھے سے قیس، کسنڈرا اپنی دو تین دوستوں کے ساتھ اپنی واکس ویگن کار میں آئے، گاڑی روکی اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی میں جگہ نہیں ہے۔ سب لڑکیاں تھیں۔ وہ مجھے لڑکیوں کے

ساتھ بٹھانا چاہتے ہیں۔ میں بلوچستان، ذہنی طور پر اس قدر بے زنجیر نہ تھا۔ میں نے بہانہ کیا، شکریہ کہا اور آگے بڑھا۔ گاڑی پھر میرے قریب آئی اور کسنڈرا بولی: ’’ہم خواتین میں سے کسی کو بھی کوئی متعدی بیماری نہیں، آؤ بیٹھو‘‘۔ بھئی، تابوتوں میں بند ذہن سے خطرناک چیز دنیا میں کیا ہوگی؟۔ میں ہنس کر جھینپ کر پھر شکریہ ادا کر کے آگے بڑھا۔ ہماری ضدی دوست میرے اس Taboo کو توڑنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ پھر گاڑی قریب لائی اور اس نے کہا، ’’میں نے تمہاری شرمیلا گیری کا حل نکالا ہے۔ تم آؤ بیٹھو۔ میں تمہارے اور دوسری خاتون سواری کے بیچ یہ بڑا سا پرس رکھ لوں گی‘‘۔ اس نے ایسا کیا اور ہم مہذب انسانوں کی طرح اکٹھے بیٹھ کر چلے گئے۔ اُستانی میری!!

مجھے ’’لامزریبل‘‘ پڑھنے کی ترغیب اُسی نے دی تھی۔ وپٹسا روف اور اُس کی شاعری سے روشناس اسی نے کرایا۔

’’لَو برڈ‘‘ کا لفظ اسی نے میری ڈکشنری میں ڈال دیا تھا۔ میں نے یہ پرندہ دیکھا بھی نہ تھا اور اس کے بارے میں جانتا بھی نہ تھا۔ ہوا یوں کہ میرا ایک بگٹی ڈاکٹر دوست اپنی پسند کی خفیہ شادی کر کے اپنی بیگم کے ساتھ کچھ عرصہ میرے پاس ٹھہرا رہا اور مختلف پارٹی دوستوں کی مہمان نوازی سے محظوظ ہوتا رہا۔ جب اُن کا معاملہ ٹھیک ہوگیا اور وہ واپس چلے گئے تو ایک عرصے تک کسنڈرا پوچھتی رہی۔ ’’لو برڈز کا کیا حال ہے؟‘‘۔..........وہ خود بھی تو لو برڈ تھی۔

کسنڈرا عورتوں کے حقوق کے لیے بہادری سے لڑنے والی عورت تھی۔ انگریزی روزنامہ ’’فرنٹیر پوسٹ لاہور‘‘ اَسی کی دہائی میں اچھا خاصا علمی اخبار ہوا کرتا تھا۔ کسنڈرا نہ صرف اس میں لکھتی تھی بلکہ اس کے ایڈیٹروں کی صف میں شمار ہوتی تھی۔ اسی طرح انگریزی کا ایک اور اخبار ’’دِی مسلم‘‘ بھی بہت اچھا اور ہم لوگوں میں مقبول اخبار ہوتا تھا۔ کسنڈرا اُس میں باقاعدہ دفتر لگا کر کام کرتی تھی۔ ہماری بہت سی بحثیں وہیں اس کے دفتر (فلیٹیز ہوٹل) میں رہیں۔ اسی طرح وہ مظہر علی خان کے انگریزی ہفت روزہ ’’ویو پوائنٹ‘‘ میں لکھتی تھی، جسے ہم ایک باوقار علمی سرچشمے کے بطور پڑھتے تھے۔ اسی طرح عورتوں کے حقوق کی ایک تنظیم ’’شرکت گاہ‘‘ تھی۔ وہ اس میں کام کرتی رہی۔ اور اس کے رسالہ کو ایڈٹ کرتی تھی۔

میں ایک وفد کے ہم راہ کسنڈرا کے ساتھ ایک غیر ملکی سفر میں بھی ساتھ رہا۔ وہ بہت اچھی ہم سفر تھی۔ اچھی معاون، راستہ دکھانے والی، مشورے دینے والی، بحثیں کرنے والی اور ذمہ لگائے کام کو بخوبی سرانجام دینے والی۔

کسنڈرا ہم سب کی طرح سوشلزم سے وابستہ ہوگئی۔ سند وسٹرفکیٹ تو ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا کہ ہم اس سٹرفکیٹ کے اصل نقل کے چکر میں ہندوسندھ وافغان وایران میں ہیبت ناک خانہ جنگیاں دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا نہ فریم شدہ سٹرفکیٹ تھے ہمارے پاس، اور نہ اپنے ناموں کے ساتھ لفاظی بھرے سابقے لاحقے۔ کسنڈرا ہم لوگوں کے طرزِ سیاست کو اچھا سمجھنے لگی۔ اور بغیر کسی گرج دار اعلان کے اس کارواں میں کام کرنے لگی۔

قیس، کسنڈرا کافی عرصے تک ساتھ رہے۔ میں تعلیم مکمل کر کے، اِن میاں بیوی سے دور اپنے وطن آ چکا تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ دو بچوں کے ان والدین کی شادی ٹوٹ گئی۔ کسنڈرا لندن چلی گئی۔ ہماری ملاقاتیں ختم، یادیں سلامت۔ جب بھی لاہور جانا ہوتا یا فون پہ بات ہوتی تو سی آر اسلم سے اس کی خیریت معلوم ہوتی رہتی۔ پھر سی آر اسلم خود نہ رہا۔ کس سے پوچھتے؟ کیا پوچھتے، کس چیز کے بارے میں پوچھتے......کہ شاگرد، ہم جماعتوں سے کم کم پوچھتے ہیں۔

اب فیس بک پہ پڑھا کہ کینسر سے کسنڈرا وہیں لندن میں فوت ہوگئی۔ پھر وہی مسئلہ: کوئی کسی سے کیا شیئر کرے؟، کوئی کسی سے کیا تعزیت کرے کہ اس سب کچھ کا شایانِ شان کوئی رہا ہی نہیں۔ بد بخت موت نے ایسے احباب کم چھوڑے جن سے اُس وقت کے مشترکہ دوستوں کے تذکرے رہیں۔ جن قارئین کے لیے یہ مضمون لکھ رہا ہوں، بس انہیں یہ بتانا ہے کہ وفا انسان کی اچھی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ یہ بھی کہ راہِ وفا پہ چلنے والے راہرو کو کبھی اجنبی نہیں جانے دینا چاہیے۔ یہ بھی کہ میں اکیلا کیوں اُس اچھے انسان کو یاد کروں، آ وَمل کر اُسے سلام کہتے ہیں............
سرسبز ودوام دار سلام۔ سلام کسنڈرا بالچن!

دانش کے خُشکابہ کا تازہ میٹھا پانی

خلیل صدیقی

(چار اگست 1921..........10 مارچ 1996)

خلیل صدیقی کے بارے میں کبھی کسی نے نہ پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا اور کب آیا۔ البتہ وہ خود اپنی گفتگو کی روانی میں کبھی عمومی سا تذکرہ کر دیتا کہ وہ جبل پور سے تھا اور دسمبر 1948ء میں کالج استاد کی حیثیت سے کوئٹہ آیا۔ وہ 1972ء میں ڈائریکٹر ایجوکیشن بنا اور 1974 میں چیئرمین بورڈ کا چارج بھی اُسے دیا گیا۔ 1980ء میں وہ ڈائریکٹر ایجوکیشن بلوچستان کی حیثیت میں ریٹائر ہوگیا۔ اُسی سال اسے بلوچستان یونیورسٹی میں پاکستان اسٹڈیز سنٹر میں ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ وہ تین سال تک یہیں کام کرتا رہا۔

جناب خلیل صدیقی سے میرا تعارف پتہ نہیں کب ہوا............اس لیے کہ جب میں میڈیکل کالج میں آیا تو میں نے خلیل صدیقی کا نام پہلے ہی سن رکھا تھا۔ میں نے اُسے تعلیمی اداروں کی پرنسپلی کرتے سنا تھا، میں نے اسے محکمہ تعلیم کی ڈائریکٹری کرتے سنا تھا۔ مگر دلچسپ ہے کہ اُن کی تعلیمی قابلیت اور دانش ورانہ دنیا کی سلطانی کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ بس ''اچھا افسر ہے، اصول والا انسان ہے'' کا سنتا رہتا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی کوئی خاص میل ملاقات نہ ہوئی۔ وہ تو جب سائیں کمال خان شیرانی سے ہوتے ہوئے میں ڈاکٹر خدائیداد اور ماما عبداللہ جان

جمالدینی کی رفاقت میں آیا، تب صدیقی صاحب کی علمی بڑائی اور اُس کے خیالات کی بلندی سے آ گاہ ہوا۔ اور پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہم رفیقِ کار بن گئے۔ پتہ نہیں استادی شاگردی کو اداروں میں گھسیٹ کر ''لیس سر، لیس سر'' تک کیوں محدود کیا جاتا ہے۔ ہم تو کلاس روم سے باہر کے استاد شاگرد تھے...... ادب کے، لسانیات کے، روشن فکری کے، اخلاقیات کے۔ اور یہ استاد اشتہار نہ دیتا تھا: استادی کا بھی اور روشن فکری کا بھی۔

یہ بلوچستان میں پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کا تیسرا جنم تھا۔ یہ ایسوسی ایشن بھی بلوچستان کے خشکابے والے نالوں جیسی رہی ہے۔ جن میں ایک جگہ پانی بہتے نظر آتا ہے، پھر میلوں تک نالہ بالکل خشک رہتا ہے، پھر کہیں جا کر دکھائی دینے لگتا ہے۔ بعین ہی پچھلی صدی کی چالیس کی دہائی میں ایک آدھ بار سر نکالنے کے بعد یہ تنظیم پچاس برس تک انسانی نظروں سے اوجھل کسی انکُو بیٹر میں پڑے رہنے کے بعد 1980ء کی دہائی میں ''گولڈن جوبلی'' کے نام پہ نظر آئی اور نظر آتے ہی نظرِ بد کا شکار ہوگئی۔ ایک بار پھر لمبا آبِ گم' اور ایک بار پھر سرِ آب۔

نوے کی دہائی تھی۔ پاکستان میں ہر جگہ یہ ایسوسی ایشن ہائبرنیشن میں تھی۔ مگر بلوچستان نے ایسا نہیں کیا۔ بلوچستان ہمیشہ وقت کے بہاؤ کے الٹ چلتا ہے۔ جو چیز لوگ چھوڑ چھاڑ دیتے ہیں (اخلاق، انقلاب......) تو بلوچستان کہہ اٹھتا ہے کہ ''کون کہتا ہے انقلاب ختم ہوا؟''۔ اسی خصلت کی بنا پر ہی، ہم کوئٹہ میں پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کو زندہ تابندہ رکھے ہوئے تھے۔ بلوچستان زندہ باد۔

اب کے خلیل صدیقی اس ایسوسی ایشن کی ادبی تنقیدی نشستوں کی صدارت کرنے لگا۔ تنقیدی نشستیں کیا تھیں بس یک طرفہ کاروائی ہوا کرتی تھی۔ بھلا اُس نشست کو آپ کیا تنقیدی بنا پائیں گے جہاں عطا شاد اپنی شاعری پڑھتا ہو۔ جہاں عبداللہ جان اور خدائیداد سامع ہوں اور جہاں منہ پھٹ امیر الدین منہ پہ پلاسٹر چڑھائے منتظم و میزبان بنا ہوا ہو۔ بس پڑھنے والے پڑھتے تھے اور خلیل صدیقی صدارتی خطبہ دیتے تھے۔ ہیلپر سکول کا ہال بھرا رہتا۔ ادبی ذوق کی تسکین ہوجاتی، نظریاتی پیاس سیراب ہوجاتی اور انفرادیت اجتماع میں ضم ہوجاتی۔ بہت اچھے دن تھے وہ۔

محترم انوار احمد نے اپنی تحریر میں کہیں اُس کے شاعر ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔(1) ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا، مگر یہ اس کی زندگی کا ایک ایسا گوشہ ہے، جس کے بارے میں یہاں بلوچستان میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ شاعری شاید بہت کم لکھی' یا شائع بہت کم ہوئی۔ یا پھر اُس کی شاعری پہ لکھا کم گیا ہے۔ اس دلچسپ پہلو کو ضرور سامنے آنا چاہیے۔

ہم نے اپنی ایسوسی ایشن کا ایسے ہی کسی کو صدر، سیکرٹری بنا رکھا تھا۔ اصلی صدر تو یہی لوگ ہوا کرتے تھے۔ صدیقی صاحب بہت دھیما مگر بہت اچھا بولتے تھے۔ بہت ہی خوش سخن اور خوش گفتار انسان تھے۔ اُس کی عادتیں بہت اچھی تھیں۔ ادب کے ساتھ بڑی ایمان داری سے نمٹ چکنے کے بعد سماج، سماجیات اور نظریہ کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوجاتا۔ سارا ٹرین ہی اُس کی تھی۔ اُس کے لیے کوئی ٹکٹ چیکر، کوئی گارڈ، کوئی پولیس کا ڈبہ نہ تھا۔ وہ خود ہی اِس سپورٹس کا کیپٹن، کوچ اور مینیجر تھا۔ سارے بلوچستان کا ٹیچر رہ چکا تھا۔ اس لیے سب سفید بالوں والے لوگ خود 'سر' ہوتے ہوئے بھی اسے سر سر کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ایک ہم تھے کہ حیران پریشان کہ عبداللہ جان انہیں سر کہے تو ہم بھلا کیسے صرف صدیقی صاحب کہہ سکتے تھے۔ اس لیے سر نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ہمارے سر تھے۔ اُسے بھی عجیب لگتا، مجھے بھی غیر مانوس سا لگتا۔ مگر ایسا ہی ہوتا ہے احترام کی دنیا میں۔

خلیل صدیقی بلوچستان بھر سے واقف تھا۔ وہ مستنگ، خضدار، ژوب اور گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ کا پرنسپل رہ چکا تھا۔ ڈائریکٹر تعلیم، چیرمین ثانوی بورڈ اور بلوچستان یونیورسٹی کے پاکستان سٹڈیز کا ڈائریکٹر رہ چکا تھا۔ وہ وزیر اعلیٰ بلوچستان کے امورِ تعلیم کا مشیر بھی رہا۔ چوں کہ تقریباً ساری ملازمت یہاں کی تھی (ماسوائے کچھ عرصہ غیر قانونی، غیر اخلاقی، غیر آئینی اور غیر ضروری ون یونٹی دور میں ملتان میں گزارنے کے)، اس لیے ہر جگہ اور ہر علاقہ کی زبان اور ثقافت سے آشنا تھا۔ اور جہاں خود نہیں جا سکا تھا، وہاں اُس کے شاگرد ہوا کرتے تھے۔ اور اُس زمانے کی استادی شاگری واقعی استادی شاگردی ہوا کرتی تھی۔ گھر کے فرد کی سی وابستگی ہوتی تھی۔ خلیل صدیقی بلوچستان کے ہر گوشہ کے گھر کا فرد تھا۔

استاد ہر شاگرد کے اخلاق، تلفظ، لباس، نشست و برخواست، حلقہِ احباب، اور غیر نصابی سرگرمیوں کے بارے میں واقعتاً باخبر اور ذمہ دار ہوتا تھا۔ کوئی سرکاری احکامات نہ تھے۔ بس، غیر محسوس اور غیر سرکاری طور پر خلیل صدیقی اور کرار حسین جیسے لوگ مکمل طور پر اپنے شاگرد کو بدل ڈالتے تھے، اُسے تہذیب کی بلند تر سطح تک لے جاتے تھے۔

خلیل صدیقی نے اِس مختصر عرصے میں ہماری تنظیم کی اچھی بھلی ذہنی اور انٹی لیکچوئل صفائی کردی تھی۔ میں اُس زمانے میں 'نوکیں دور' کی ایڈیٹری کرتا تھا۔ وہ میرے بہت ریگولر اور باریک بین قاری ہوتے تھے۔ پورے کے پورے رسالے پر تبصرہ کرتے تھے، انہیں زبانی طور پر یاد ہوتا تھا کہ کون کون سے مضامین چھپے ہیں، اُن میں کیا کیا لکھا ہوا ہے۔ اور پھر اُن پر اپنی رائے دیتے تھے۔ حالاں کہ مجھے بہت زعم تھا کہ میں چار سال تک سی آر اسلم کی شاگردی میں ''عوامی جمہوریت'' سے وابستہ رہ کر صحافتی دنیا کا سب کچھ جان چکا تھا مگر یہاں آ کر اپنی کم مائیگی کا خوب خوب اندازہ ہوا۔ اور کیوں نہ ہوتا؟ میرے احباب میں 50ء کی دہائی میں چھپنے والے مجلّہ ''پشتو'' کے ایڈیٹر خدائیداد تھے، ''نوائے وطن''، ماہنامہ بلوچی' ماہنامہ اولس، اور سوویت رسالے طلوع کے عبداللہ جان جمالدینی تھے اور خلیل صدیقی تھے.........خدا ہر انسان کو ایسی صحبت نصیب کرے۔

ایک بار دوستی کے اعتماد میں آ کر بغیر چیک کیے میں نے ایک مشہور افسانہ نگار کی تحریر چھاپ دی جس میں اردو زبان کو بہت بڑی گالی دی گئی تھی۔ صدیقی صاحب بہت عرصہ بعد ملا تو نہ صرف احتجاج کیا بلکہ جرمانے کے بطور کوئی پونے دو گھنٹوں کا لیکچر بھی پلایا۔ سچی بات ہے مجھے بہت سی باتیں بھول سکتی ہیں مگر وہ لیکچر نہیں بھولتا۔ نظریاتی طور پر اِس قدر واضح اپروچ کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور پھر اِس قدر رواں لیکچر کہ لگتا تھا وہ خود سے بول نہیں رہا بلکہ وہ کچھ پڑھ کر سنا رہا ہو۔ کوئی بے ربطی نہیں، فقروں یا لفظوں کی کوئی تکرار نہیں، موٹروے پہ سفر کی طرح ہموار، رواں اور علمیت بھری گفتگو۔ اُس کی امتیازی بات یہ تھی کہ وہ اپنی اہلِ زبانی، اور عالمی بالکل نہ جتاتے تھے۔ چھلکے نکالے ہوئے بادام کی طرح......

صدیقی صاحب عام فہم اردو میں بولتے تھے۔ اور کچھ ایسا بولتے تھے کہ انسان کو سنتے ہی

رہنے کی خواہش ہو جاتی۔ دماغ میں دلیل والی جگہ کی تشفی ہو جاتی۔ وہ کمال آٹو پائلٹ جہاز تھے۔ خود بخود اپنے مخاطب کی علمی سطح تک نیچے آ جاتا اور وہاں سے اُسے ساتھ لے کر آسمان کی وسعتوں تک گھما لاتا۔ اور مجھے اندازہ ہے کہ وہ دل کی گہرائی سے، شوق سے لیکچر دیا کرتا تھا، کسی سماجی یا دوسری مجبوری سمجھ کر خود پہ جبر نہ کرتا تھا۔ وہ شاید بنا ہی استاد والے سانچے میں تھا۔

خلیل صدیقی صحافت کے علاوہ بھی میری اچھی خاصی اصلاح کیا کرتا تھا۔ پڑھنے کے لیے کتابیں تجویز کرنا، ترجمے کے لیئے راہبری کرنا، رسالے کے گیٹ اپ کی بہتری پر توجہ دلانا اور اُس میں مضامین، افسانوں اور شاعری کے شعبوں میں تبدیلیاں لانا............ خلیل صاحب میرے دکھائی نہ دیے جانے والا کیریکٹر بلڈر بنا۔ ویسے بھی وہ فطرتاً خاموش کارکن جیسا انسان تھا۔ کبھی بھی بطخ کی طرح سر اونچا کر کر کے اپنی بلند قامتی کا اشتہار نہ دیتا تھا۔ بس شہد کی مکھی کی طرح ہمہ وقت علم کے اپنے اصلاح و تعمیر کے کام میں سر گھسائے کام کرتا تھا۔

اچھا، اگر یہ تاثر جا رہا ہے کہ وہ کوئی برانڈ اور لیبل لگا کر ایک مخصوص طرزِ فکر کا بڑا تھا، تو پھر تو غلطی ہو رہی ہے۔ خلیل صدیقی صاحب رجعت پسند نہ تھا، انتہا پسند نہ تھا، بس۔ باقی' وہ ہر ایک مکتبِ فکر کے ساتھ اُن کی تعمیر و بہتری کے لیے کام کرنے پر آمادہ رہتا۔ وہ بحیثیتِ مجموعی ادب اور ادیب کا خدمت گزار تھا۔ کوئی برانڈ اسے قید نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اُس زمانے میں بے ہودہ برانڈ ہوتے بھی نہ تھے، کم از کم بلوچستان میں۔ دیسی ثقافت سے ابھرا ہوا ایک ہی برانڈ ہوتا تھا: انسان دوست برانڈ۔ اُس میں ظاہر ہے کمی بیشی موجود تھی اور جسے مسلسل پلستر اور سفیدی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور صدیقی صاحب تو تھا ہی مستری: ذہن کا، خیالات کا، زبان کا، ادب کا، اور روشن فکری کا۔ وہ شعور کا سپیشلسٹ تھا۔ تغیر کے پیر کا مرید تھا۔ وہ باقاعدہ اقتباسات تو نہیں سناتا تھا مگر جو کچھ بھی اپنے الفاظ میں بولتا تھا، وہ تھا بڑے فلاسفروں اور انقلابیوں کا مکتبِ فکر۔ وہ اپنے مخاطب کو وہیں سے اٹھاتا جس سطح پہ وہ ہوتا، مگر اسے لے کر پہنچاتا تھا انقلاب تک۔ جس کسی کو بھی اُس کی دانش کے اوطاق سے کٹورہ پینے کی سعادت حاصل ہوئی، وہ پھر کبھی سماج سے لاتعلق، بے شعور، ناآگاہ نہ رہا۔ صدیقی صاحب اُسے اولیا، صوفیا اور انقلابیوں کی راہِ مبین پر لگا دیتا۔

سٹیلائٹ ٹاؤن کوئٹہ میں اس کا مکان تھا۔ (شاید صرف اور صرف یہی ایک جائیداد تھی اُس تاحیات پرنسپل اور کافی عرصہ ڈائریکٹر رہنے والے انسان کی۔ اس لیے کہ میں نے کسی اور شہر میں اس کی جائیداد کے بارے میں کبھی نہیں سنا)۔ وہاں اس کے گھر ہم اسے لینے یا پہنچانے جاتے تھے، کبھی کبھی بیٹھک میں بیٹھ بھی جاتے۔ کیا سادہ مکان اور سادہ زندگی تھی اُس کی ۔صدیقی صاحب کی قلندرانہ شان والی بود و باش تھی۔ چوں کہ اچھے ٹیچر تھے، اس لیے اپنی اولاد کو عام سرکاری سکولوں میں پڑھایا۔ اُن کو غرور کے نزدیک آنے نہ دیا، اُن کے لیے سفارشیں نہ کیں، اُن کے لیے جاگیرداروں کے ہاں رشتے نہ مانگے۔ اُن کا ایک بیٹا تعلیم سے وابستہ ہے اور دوسرے ڈاکٹر ہیں۔ اس ڈاکٹر کے گھر میں میری بہت ہی احترام والے دوستوں کی بہن بیاہی ہوئی ہے۔

صدیقی صاحب اکثر (بلکہ ہمیشہ) کوٹ پتلون میں ہوتا تھا۔ کلین شیو، پیچھے کنگھی کیے ہوئے گھنگریالے بال۔ اُس سے نہ تو ملاقات میں مشکل آتی تھی اور نہ ابلاغ میں۔ مگر اسنے کتابیں بہت سخت موضوع پر لکھیں: لسانیات پر۔ صدیقی صاحب نے ''لسانیات'' جیسے مشکل مضمون پہ پانچ کتابیں لکھیں: زبان کا مطالعہ، زبان کا ارتقا، لسانی مباحث، زبان کیا ہے' اور، آواز شناسی۔ اللہ جانتا ہے کہ مارکسزم اور صدیقی صاحب سے عقیدت کے سبب ہی میں نے وہ کتابیں پڑھی تھیں۔ اب جب کہ عقل داڑھ اگنے کے آثار پیدا ہوگئے ہیں تو اُن کی اِن کتابوں کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور دیکھتا ہوں تو یہ کتابیں اتنی مشکل زبان میں بھی نہیں ہیں جس کی مجھے شکایت ہوا کرتی تھی۔

اُس کی کچھ کتابیں ملتان میں چھپیں۔ کچھ لوگوں کے مضامین میں اُس کی ملتان نوکری سے متعلق مضامین پڑھے، مگر سچی بات ہے کہ اُس کی زندگی میں مجھے اُس کی ملتان سکونت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوا۔ وہ تو بعد میں جب ملتان کے ڈاکٹر انوار احمد سے دوستی ہوئی، تب معلوم ہوا کہ خلیل صاحب وہاں بھی اچھی خاصی تعداد مقلدین، معتقدین کی پیدا کر بیٹھے۔ بڑے انسان بڑے جغرافیائی خطے کو فیض یاب کرتے ہیں۔ اب تو اُس پر بلوچستان سے زیادہ، ملتان میں

لکھا جا رہا ہے۔ بلکہ بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی میں اُس کے نام کا تحقیقی مرکز ہے۔ میں نے اس سینٹر کی لائبریری کو کتابوں اور تحقیقی مواد سے بھرا پایا۔

جیسا کہ ذکر ہوا خلیل صدیقی نمائش وستائش کی دنیا سے بہت دور کے آدمی تھے۔ کوئی اکڑ نہیں گردن میں، کوئی نخوت نہیں ماتھے پہ اور کوئی منافقت نہیں سینے میں۔ کیا آپ ''اطمینانِ قلب'' کے لیے ضروری کچھ اور باتوں کا اضافہ کرسکیں گے؟ جی ہاں، ایک بات اور۔ خلیل صدیقی کو کسی کی نسل، زبان، عقیدہ، اور رنگت سے بغض نہ تھا۔ سو فیصد بے تعصب انسان۔ بے خلش اور بے ندامت زندگی گزارنا شاید اُس دور کے انسانوں کا ماحول تھا۔

سچ بولے بغیر بھلا اچھا استاد ہونا ممکن ہے؟ جب آپ انسانوں کو سچائی کا راستہ دکھانے کا فریضہ ادا کررہے ہوں تو خود کو سچ اور حق کے دائرے میں ڈال اور ڈھال کر یہ منتر پڑھتے رہنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا تو جھوٹ کا دیو برباد کردے گا۔ صدیقی صاحب پہ جھوٹ کے دیو کا فسوں کبھی نہ چلا کہ آپ فکر کی کم زوری سے پاک تھے۔

ہمارا دور اگر ایک طرف مہاتما انسانوں کا دور تھا تو دوسری طرف راونڑوں کا عہد بھی تھا۔ اور ان راونڑں کا سردار تھا: ضیاالحق۔ اُس کے ملیچھ ناخن خلیل صدیقی کے پاک چہرے پہ بھی جھپٹے۔ نوکری سے برخواست، بھینس چوری کے جھوٹی الزامات جیسی حقیر تہمتیں ان پہ لگائیں ...... خلیل صدیقی خیر کیا جھکتے کہ اُن کے کاندھے تو خودداری اور استقلال کے بوجھ نے کب کے جھکا رکھے تھے۔ دنیاوی رکوع، دنیا دار لوگ کرتے ہیں۔ صدیقی صاحب اپنے بچوں کی کم سنی کو خاطر میں نہ لائے اور بے روزگاری کو ترجیح دی۔ ضیاالحق رسوائی کے ساتھ فانی دنیا چھوڑ گیا مگر خلیل صدیقی مرکر بھی دلوں پہ راج کرتے ہیں۔

بڑی معصومیت کا زمانہ تھا۔ کرار صاحب اور خلیل صدیقی کے بارے میں بہت معصوم لطیفے مشہور ہیں بلوچستان میں۔ اُن کی پاکیزگی کے بارے میں، سادگی کے بارے میں، مہذب پن کے بارے میں، زبان کی ستھرائی کے بارے میں۔ کبھی ہمارا سماج سننے کے' اور میں سنانے کے لائق ہوا تو وہ لطیفے ضرور لکھوں گا۔

10 مارچ 1996ء اُن کا سنِ انتقال ہے۔

اِن کی اولاد کو ہم سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے مگر ہمیں تو اپنے سینئر ساتھی کی اولاد کا خیال رکھنا چاہیے۔ بس صرف ایک رسالہ 'سنگت' انہیں ڈاک سے بھیجتا رہتا ہوں.......... قربِ قیامت کے اِس عہد میں یہی غنیمت ہے۔

حوالہ وحاشیہ

1۔ انوار احمد۔ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ۔ 2008۔ مثال پبلشرز فیصل آباد۔ صفحہ 86

* نوخاف:۔ بارش کا تازہ میٹھا پانی

در بدر، خاک بسر

ہم سب کے اور بالخصوص ڈاکٹر خدائیداد کے احباب میں بدرالحسن صاحب بھی ہوتا تھا جو کچھ اور سوچتا یا نہ سوچتا، کچھ اور کرتا یا نہ کرتا، کچھ اور کہتا یا نہ کہتا، کٹھ ملائیت کے خلاف ضرور بولتا تھا۔ اور اگر اور کہیں نہیں بولتا تو خدائیداد کی محفل میں تو ضرور بولتا تھا کہ وہاں اسے کوئی پابندی، کوئی خوف خدشہ اور کوئی مزاحمت کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ معمر شخص تھا۔ اسے کسی نے جوانی میں بھی فربہ نہیں دیکھا ، اس کی صرف آواز موٹی تھی یا آنکھوں کی عینکوں کے شیشے موٹے تھے۔ وہ اہلِ زبان تھا (پاکستان میں صرف اردو زبان والے ہی کو اہلِ زبان کہا جاتا ہے، باقی یا تو 'نا' اہل زبان ہیں یا اہلِ بے زبان)۔ بدر صاحب محکمہ تعلیم میں افسر رہا اور یہاں وہاں تبادلوں کی مناسبت سے جعفر اچکزئی اسے بدر کے بجائے ''دربدر'' کہتا تھا۔

بدر، نہایت ہی روشن فکر شخص تھا۔ وہ اس خطے کو ایک جمہوری، سیکولر اور ترقی یافتہ خطہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ریٹائرڈ زندگی کراچی اور حب میں اپنے بیٹوں کے ساتھ گزارتا رہا۔ کوئٹہ جب بھی آتا تو دوستوں کو سلام کرنے خدائیداد کے پریم گھونسلے میں حاضری ضرور دیتا رہا۔

تمکین احمد عباسی بھی محکمہ تعلیم سے وابستہ رہا اور ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوگیا۔ اور سریاب روڈ پہ ایک مینار کے قریب والے محلے میں رہتا ہے۔ اس مینار کا نام دوستوں نے ''تمکین کا مینار'' رکھا ہے۔ دور سے نظر آئے تو ہم باجماعت پکار اٹھتے ہیں: ''وہ ہے تمکین صاحب کا مینار''۔ (خدائیداد ایسے موقع پر قائد، قائدعوام، قائد ملت یا قائداعظم کو ضرور یاد کرتا تھا)۔

یہ دنیا لکڑ بھگڑ کا بل کھاتا ہوا خمدار غار ہے۔ اتنا پُر پیچ کہ سادگی کا سر چکرا جائے۔ اب دیکھئے نا، تمکین صاحب کا اصل وطن بلوچستان نہیں، پاکستان نہیں بلکہ وہ دراصل ہندوستان میں ضلع بلند شہر کے قصبے گلاوٹی میں جنم لینے والے شطرنج کا مہرہ ہے جسے تقسیم ہند کی بچھی بڑی بازی میں شاہوں وزیروں اور فیلوں سے جان کی امان لینے کبھی اِس افق بھاگنا پڑا، کبھی اُس سمت پناہ لینا پڑی۔ دوسوا ایڈوانیوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیا تو تمکین دہلی بھاگ گیا۔ وہاں سے ٹرین میں پاکستان کے لیے بیٹھا تو ہریانہ کے ''سرسے'' کے مقام پر ہمارے اس ہمّل کی ٹرین کو پرتگیزیوں جیسے سفاک بلوائیوں نے روک کر غیر ہندوؤں کا قتلِ عام شروع کیا۔ تمکین ننگے پاؤں والد اور بھائیوں کے ہم راہ بھاگ کر ''سرسے'' شہر میں حکیم محمد عبداللہ کی حویلی میں پناہ گزین ہوا۔ دولت مند حکیم نے دو ماہ تک دیگر پناہ گزینوں کے ساتھ ان چاروں بے وطنوں کو اپنی حویلی میں رکھا۔ جس کے بعد تمکین نے تین لاکھ افراد کے اس قافلے میں شامل ہو کر پاکستان کی طرف خود کو دھکیلا جو راجپوت گاؤں بھیگڑ سے آ رہا تھا۔ جان کی امان کے لیے اس فرار میں ایک ہفتہ لگ گیا اور فطرت کے ہر مظہر کے پیچھے قاتل چھپے ہونے کا مستقل وسوسہ بہاولپور پہنچ کر طبعی طور پر تو ختم ہو گیا مگر نفسیاتی گھاؤ نا قابل بیاں گہرائی پا گیا۔ یہ لوگ پھر ملتان منتقل ہو گئے۔ ان کے گھر کی خواتین براستہ آگرہ، بمبئی گئیں اور وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے پاکستان پہنچیں۔

برصغیر میں ایک تمکین احمد نہیں ہے، لاکھوں ایسے لوگ ہیں جن کی تلخ یادوں کے دُمدار ستارے انہیں اپنے آبائی گاؤں تک روزانہ کئی بار گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ اور اس گرد و غبار کے بیچ پیاروں کی مسخ شدہ لاشیں ہیں، ماؤں بہنوں کی عصمت دریاں ہیں، زہر آلود بے عزتیاں ہیں۔ بلا شبہ ان نفسیاتی زخموں کو مندمل ہونے میں طویل زمانہ لگے گا جن کا رِستا خون نسلوں کے جینز میں شامل ہو چلا ہے۔ نفرت، انتقام، دشمنی اور بدخواہی نے بلوچستان کے جنوبی خطے کو ساٹھ برس سے خون رستا ہوا زخم بنا کر رکھا ہے۔

تمکین عباسی نے کبیر والا (ملتان) سے مڈل اور خانیوال سے میٹرک پاس کیا۔ اس نے ایمرسن کالج ملتان سے بی اے آنرز کیا اور 1955ء میں لاہور سے بی ٹی سی ٹی کر لی۔

اُسی زمانے میں بدرالحسن اور تمکین کی دوستی ہوئی۔ ان دونوں دوستوں کی ملاقات ستمبر 1954ء میں سید سبط حسن سے ہوئی۔ وہی سبط حسن جنہوں نے ''موسیٰ سے مارکس تک''، لکھی اور ''ماضی کے مزار'' تصنیف کی۔ جو ماہنامہ ''پاکستانی ادب'' نکالتے رہے اور وہی سبطے جنہوں نے ہماری نسل کے ہزاروں انسانوں کو متاثر کیا۔ فیصلہ ہوا کہ سبط حسن کی سربراہی میں ایک سکول کھولا جائے .... پیسہ نہیں، جگہ نہیں، وسائل نہیں لہٰذا منصوبہ حاملہ ہی نہ ہوا۔ یاریاں جاری رہیں۔ تمکین نے ٹیکسیشن سروس کا امتحان بھی پاس کر رکھا تھا مگر سبط حسن اور بدرالحسن (ہندوستان سے مہاجر بننے والوں میں حسنؓ اور حسینؓ کے پیروکار کس قدر زیادہ ہیں!!) نے اُسے اس رشوت خور محکمہ میں ملازمت کرنے نہ دی۔ بلکہ سبطے صاحب نے اسے بلوچستان جا کر درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہونے کا مشورہ دیا

چنانچہ بدر اور تمکین (یا تمکین اور بدر) سبط حسن کی ہدایت پر 1955ء میں بلوچستان آ گئے اور بلوچستان سٹیٹ یونین حکومت میں بطور استاد خدمات سرانجام دینے لگے۔ سینئر انگلش ٹیچر بھرتی ہونے سے لے کر نومبر 1994ء میں تعلیم کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائرمنٹ تک وہ ایک استاد ہی رہا۔ اٹھتے بیٹھتے ہمہ وقتی ٹیچر۔ تمکین نے کبھی بھی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیا۔ بلوچستان آتے وقت، البتہ سید سبط حسن نے اسے مارکسزم کی جو کتاب پڑھنے کے لیے دی تھی، وہ وابستگی اس نے زندگی بھر جاری رکھی۔ تمکین نے سکول لیول میں سیاست کا راستہ ہموار نہ کیا۔ اس کے خیال میں ایسا کرنے سے نہ تعلیم مکمل ہوگی اور نہ سیاست۔

ڈاکٹر خدائیداد اور ان کی ''1955ء کی کمپنی'' سے تمکین کی ملاقات، اُسی سال ہوئی تھی۔ بدرالحسن اور لالہ غلام محمد شاہوانی نے یہ ملاقات کروائی۔ تب سے ان احباب سے ان کی دوستی جاری رہی۔ تمکین صاحب بہت اچھی اردو بولتا ہے۔ انداز بڑا دھیما ہے۔ غیر مستحسن بات کو بھی اچھا خاصا ''Presentable'' بنا دیتا ہے۔ ماہنامہ ''سنگت'' کے اولین دوستوں میں سے ہے۔ غیر مصنوعی اور درویش صفت انسان۔ زبردست حسِ مزاح رکھتا ہے۔ ٹھیٹ اردو ادب پڑھتا ہے۔ البتہ ملتان میں رہنے اور تعلیم سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کے زیادہ دوست سرائیکی بولنے والے

ایجوکیشنسٹ ہیں ۔تمکین چھوٹے سے جملوں میں شگفتگی بکھیرتا ہے ۔جعفر اچکزئی اسے تمکین کی بجائے ''نمکین'' کہتا تھا۔مگر چوں کہ تمکین ، بدر صاحب کے ساتھ زیادہ اٹھتا بیٹھتا تھا،اس لیے جعفر اگر بدر صاحب کو'دربدر' کہتا تھا تو قافیہ ردیف برابر کرتے ہوئے تمکین کو''خاک بسر'' کہتا تھا۔یوں بنی ''دربدر،خاک بسر'' کی جوڑی۔

(اس جوڑی سے یاروں نے اور کئی جوڑیاں بنا رکھی تھیں: مثلاً تمکین اور برکت کی جوڑی، امیر الدین اور خان گل کی جوڑی............اور ہنسی مذاق کی یہ جوڑیاں تونسہ شریف کو ذہن میں رکھ کر بنائی گئی تھیں)۔

حمزہ واحد کا خاوند، واحد بشیر

(وفات:21 جولائی 2015)

ہمارا دوست واحد بشیر،ایک خوب صورت سہ ماہی رسالہ ''ارتقا''،مزدوروں کی جدوجہد میں نصف صدی کا اپنا تجربہ،اور اچھی یادیں دے کر فوت ہوگیا۔

وہ خود اپنی مرحومہ بیگم،حمزہ سے بہت متاثر تھا۔وہ ایک زبردست انقلابی خاتون تھی ۔جس وقت واحد بشیر سے میری دوستی ہوگئی،اُس وقت حمزہ کا انتقال ہو چکا تھا۔اُسے نہ جانتے ہوئے بھی میں اُسے پہچان گیا تھا،اس لیے کہ واحد بشیر اُسی کے متعلق گفتگو کرنا پسند کرتا تھا۔اُس نے اس کے متعلق بہت کچھ لکھ کر ہمیں بھیجا،اُس کی اپنی تحریریں بھجیں اور ہم اُن سب کو اپنے رسالے میں چھاپتے رہے۔اس نے اُس کی یتیم اولاد کو ماں بن کر پالا، پڑھایا،شادیاں کرائیں ۔واحد بشیر، محترمہ حمزہ سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔

واحد بشیر نے طالب علمی کے زمانے سے انقلابی سیاست شروع کی ۔مخدوم محی الدین کے حیدرآباد دکن سے،وہ تقسیم کے دوسال بعد پاکستان آیا۔یہیں میٹرک کیا اور کالج میں داخل ہوا۔اور این ایس ایف بن گیا۔سٹوڈنٹس پالیٹکس میں سرگرمی کے سبب اُسے شہر بدر کر دیا گیا۔اور پھر یہ شہر بدری واحد نہ رہی،جمع بنتی گئی۔

واحد،میر پور خاص میں سنار کی دکان چلانے لگا۔ڈاکے میں اس کا سب کچھ لٹ گیا۔

کراچی کی ایک فیکٹری میں ملازمت کرکے گاہکوں کے پیسے لوٹا دیے۔

ضیاالحق کا دور جس پہ نہیں گزرا، وہ واقعی تلخی ترشی سے مکمل طور پر آشنا نہ ہوا۔ واحد بشیر اُسی دجالی زمانے کا سیاسی ورکر تھا۔ وہ ہفت روزہ ''الفتح'' کا اسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ ہفت روزہ ہم سیاسی ورکروں میں کتنا مقبول رہا ہوگا۔ اُس نے خوب لکھا اور جلد ہی رسالہ جمہوری قوتوں کی آواز بن گیا۔ ضیا کے ہرکاروں (خرکاروں؟) نے واحد جان کی گردن دبوچ لی، اور پھر جیل۔ معافی اِس نے نہ مانگی، معاف اُس نے نہ کیا۔ دوسال ٹھوک دی جیل۔

باہر نکلا تو 'بزنس ریکارڈر' نامی انگلش روزنامے میں سب ایڈیٹر بنا۔ اتنے جدوجہدی ساتھی کو تو کراچی یونین آف جرنلسٹس کا صدر منتخب ہونا ہی تھا۔

اس نے اپنے احباب سے مل کر 1988ء میں ادیبوں دانش ورکو اکٹھا کیا۔ ارتقا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز نامی ادبی سیاسی تنظیم قائم کی۔ اسی نام یعنی ''ارتقا'' کا سہ ماہی رسالہ تواتر سے نکلتا رہا۔

وہ ادبی سیمینار یں، کانفرنسیں اور جلسے کراتا رہا اور اپنے شہر اور صوبے کی سرحدوں سے دور بے شمار دوست اور ہم خیال بناتا رہا۔

اس کے دوشعری مجموعے ''گلشن کے پھول'' اور ''جو اعتبار کیا'' شائع ہو چکے ہیں۔

واحد بشیر بھی ''اوپر'' چلا گیا۔ اُس کے معیار کے عادی لوگوں کو اب اس معیار کے لوگ نہیں ملیں گے۔ کس قدر اذیت ہوتی ہوگی انہیں!!۔

گوہر ملک

(26 اگست 1938ء، تا، 2000ء)

میر گل خان نصیر کی بڑی بیٹی محترمہ گوہر ملک پنجگور کے مقام پر 26 اگست 1938ء میں پیدا ہوئی۔ وہ ابھی دو سال کی تھی کہ اسے پولیو کا موذی مرض ہوگیا جس سے وہ جسمانی طور پر ہمیشہ کے لیے معذور ہوگئی۔ مگر یہ معذوری نہ اس نے قبول کی اور نہ اس کے عزم و ہمت اور ولولے سے بھرپور والد گل خان نصیر نے۔ علاج تو میسر نہ تھا لیکن وہ بیٹی کو اعتماد تو بخش سکتا تھا، اُسے تربیت سے ایک نارمل اور اچھا انسان تو بنا سکتا تھا۔ چنانچہ میر صاحب نے بچی کی معذوری کے اِس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اس کی تعلیم و تربیت کا سارا بندوبست گھر ہی میں اپنے سر لے لیا۔ نوشکی کے اُس وقت کی پسماندہ ذہنی سطح کے اندر، اور قبائلی معاشرے میں رہتے ہوئے جہاں لڑکیوں کی تعلیم کو انتہا درجہ معیوب سمجھا جاتا تھا، میر گل خان نے اپنی بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ وہ جب بھی جیل سے باہر ہوتا یا سیاست کی پُر آشوب مشقتوں سے واپس گھر آجاتا تو وہ اپنی بچیوں کی لکھائی پڑھائی اور تربیت منظم انداز میں شروع کرتا۔

ایک ذہین باپ کی ذہین بیٹی نے بہت جلد وہ سب کچھ سیکھ لیا جو باپ کی خواہش اور تمنا تھی۔

گل خان نصیر کو اپنی دونوں بیٹیوں سے بے حد پیار تھا۔ مگر گوہر ملک اس کی ہم خیال اور راز داں تھی۔ یعنی دل کی بات اُسی سے کہا کرتا۔

میر گل خان کی چھوٹی بیٹی محترمہ گل بانو کی شادی آغا ظاہر سے ہوئی اور اس نے میر و خان جیسا نواسہ عطا کر کے میر گل خان نصیر کو جیلوں اور جلا وطنیوں میں خوشی اور مسرت کی ایک رمق بخش دی۔ وہ ہر جیل خانے سے خطوط کے ذریعے بچے کی پرورش، تعلیم اور تندرستی کے لیے لکھتا رہتا۔

گوہر ملک نے ادب کی دنیا میں 56-1955ء میں ن م۔ راشد کی کتاب ''کافرستان'' کے مضمون ''ظالم سردار'' کا بلوچی میں ترجمہ کر کے قدم رکھا۔ یہ ترجمہ اس نے رسالہ بلوچی میں شائع کرنے کے لیے مرحوم آزات جمالدینی کو کراچی بھیج دیا۔ جہاں وہ شائع ہوا۔ گوہر جان کے بقول اُس کے والد نے جب وہ ترجمہ دیکھا تو بہت خوش ہوا اور اس کی حوصلہ افزائی کی (1)۔ اس کے بعد اس نے کرشن چندر اور خلیل جبران کے بہت سارے تراجم کیے۔ جنہیں رسالہ بلوچی (کراچی) شائع کرتا رہا۔ رسالہ بند ہو جانے کے بعد اس نے شورش بابو کے اخبار ''نوکیں دور'' کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ جو کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ ''نوکیں دور'' بند ہوا تو گوہر ملک کے لکھنے کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کا والد کے سیاست کے حوالے سے بار بار پابند سلاسل ہوتا اور بچوں سے دور، ملک کی مختلف جیلوں کی کال کوٹھڑیوں میں بند رہتا۔ جس کی بنا پر گوہر جان کافی حد تک گھریلو مسائل اور ذہنی انتشار کی وجہ سے ادبی دنیا سے دور ہوتی چلی گئی۔

گوہر ملک نے بلوچی ثقافت پر بڑا کام کیا۔ وہ ضلع چاغی اور دوسرے علاقوں کی شادی بیاہ اور ثقافتی زندگانی سے متعلق رسومات پر کام کرتی رہی۔ علاقے کی ضرب الامثال اور محاورات جمع کرتی رہی۔ اس کے علاوہ استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں سے بننے والی ادویات کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتی رہی۔ بعد کی عمر میں اس نے بلوچی افسانہ نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی اور بہت کم عرصے میں اِس میدان میں اپنے لیے ایک نمایاں مقام پیدا کر دلیا۔

گوہر ملک کے اپنے بقول اُس کے سولہ افسانے بلوچی زبان میں چھپ چکے ہیں (2)۔ مگر ہمیں ابھی تک اُس کے صرف آٹھ افسانے ہی مل سکے تھے۔ جن کا اردو ترجمہ ''بلوچ نے مجھے دھکا دیا'' کے نام سے سنگت اکیڈمی آف سائنسز سے شائع کیا گیا۔ مگر حال میں بچوں کے بارے میں اس کی کچھ اور کہانیاں بھی ہمیں مل گئیں۔

افسانوں میں سے ''بلک پر چہ تہا انت''، ''سنٹ'' اور ''زبو'' جیسی اس کی شہرۂ آفاق تخلیقات ہیں۔ اسی طرح زندگی کے آخری دنوں میں راسکوہ سے متعلق اُس کا لکھا ہوا مشہور افسانہ ''بلوچا منا تیلانک داشۂ'' نے بہت شہرت پائی۔ اُس کے اِس افسانے کو بلوچی افسانہ نگاری کے شاہ کار افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ''خدا جنت کہ بندہ'' اور ''جنک'' بھی اُس کے مشہور افسانوں میں سے ہیں۔

بانک گوہر ملک کے افسانوں میں بلوچ معاشرے کے خدوخال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اس کو اپنے فن پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ خوب صورت پلاٹ، زبان و بیان کی خوب صورتی، جیتے جاگتے کردار، خوب صورت منظر کشی، اور تکنیک وغیرہ پر گرفت اس کے افسانوں کو ادب کے بے مثال سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ اس کے افسانوں میں معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد ایک مستقل عنصر کے بطور موجود رہتی ہے۔ اس نے خیالی اور تصوراتی موضوعات پر نہیں لکھا۔ اس نے اپنے معاشرے میں چاروں طرف پھیلی ہوئی معاشرتی برائیوں کو افسانوی رنگوں میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ گوہر جان اپنے افسانوں میں عورتوں کی پسماندگی، ان پر روا رکھے جانے والے مظالم، اور دوسرے بہت سارے مسائل کو بیان کرتی ہے۔ وہ عورتوں کو اس بات پہ مائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ بھی انسان ہیں اور ہر جان دار کی طرح اُن کے بھی حقوق ہیں۔

اُس کے افسانے بہت ہی بلوچی افسانے ہیں۔ اوریجنل، دیسی، مقامی، اصلی۔ بڑا بے ساختہ پن ہے ان میں۔ زبان شیریں، رواں اور مسلسل۔ بغیر ابہام کا پلاٹ، بامقصد انجام، افسانویت سے بھرے افسانے ہیں گوہر ملک کے۔ اِن میں وہ بلوچی ضرب الامثال استعمال کرتی ہے، بلوچی فوک کرداروں کی طرف اشارہ کرتی ہے، تاریخی مزاج ڈالتی ہے اور نہایت ہی اپنے پن سے سماج کا تاروپود بیان کرتی ہے۔

گوہر ملک نے دیگر زبانوں کے افسانے بھی بلوچی میں ترجمہ کیے ہیں۔ یہ منتخب افسانے نہایت عوامی ہیں اور یہ انسانی زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔ محترمہ کے کیے ہوئے تراجم اس قدر خوب

صورت ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ اصل میں ہیں ہی بلوچی افسانے ۔ احمد ندیم قاسمی ، جمال ابڑو کے افسانے......

اس کے علاوہ اس نے بلوچی میں بہت اچھے مضامین بھی لکھے۔

یوسف گچکی کے مطابق، ''گوہر ملک نے نثر کے علاوہ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔مگراس نے کبھی بھی اپنے اشعار کواشاعت کے لیے رسالوں کونہیں دیا۔''

راسکوہ کے ایٹمی دھماکے کے حوالے سے اپنی ایک نظم میں کہتی ہے:

منی اِے واپچار، منی کوہِ راس اِنت
تہا دُو تکاہ اُو بنائے آس اِنت
تئی کلگانی اِے آپانہ وشیں
کئیا زہر ماں کرت باریں بگش تو؟
تئی دنگانی اِے چاپ و دمامہ
پچے بند اُو آ ء، سرگران ئنت؟
ملور و پریشان و تنگیں لنٹاں

تئی چمگانی آپانہ سارتیں
تئی کچرانی آزیدانہ وشیں

کئیا داتگنت آس، باریں بگش تو؟
کئیا زہر گوارینت باریں بگش تو؟

ترجمہ:

یہ ہے کوہِ راس جو ہے پہچان میری
کہ جس کے اوپر دھواں ہے، اور آگ اندر
زہر کس نے گھولا ہے چشموں میں اس کے
تری بیٹیوں کے دف، رقص بند
موقوف کیوں ہیں، سرگرداں کیوں ہیں
پریشان اور وہ خیالوں میں ڈوبے
بتا تیرے چشموں کے ٹھنڈے پانیوں میں
چراگاہ و سرسبز ان وادیوں میں
لگائی آگ کس نے، بتا تُو
برسادیا زہر کس نے، بتا تو

اسی طرح اپنے والد کی وفات پر نوحہ کناں بیٹی اپنے غم کا اظہار کچھ یوں کرتی ہے:

نشتگ ورےئے قدرتاں چاریں
دُریں گپتاران اِت دم دماریں
اتکہ ٹیل فونے اچ کراچی آ
قادرا برتہ جواں تریں چیّا
مالکئے کاراں بوتگوں راضی
سدسپت ربّ العزتا براضی

دُرحدیث شاعرا اے جہاں اشتہ
ڈاھے ماں کوہ و کوچگاں پرشتہ (3)

اُس کے وہ خطوط بھی ادبی سماجی اور سیاسی میدان میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں جو اس نے اپنے والد بزرگوار کی زندگی میں اسے لکھے تھے جب میر صاحب مختلف جیلوں میں ہوتا تھا۔ یا پھر

وفات کے بعد جب اس نے اپنے عظیم باپ کی روح کو مخاطب کر کے لکھے ۔ یہاں اُس کے لکھے ہوئے صرف ایک خط کا ایک حصہ نمونہ کے طور پر پیش کیا جا تا ہے جواس نے اپنے والد کی وفات کے تین سال بعد اس کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا۔

وہ کہتی ہے۔(اردو ترجمہ):

''میرے اچھے بابا!

جنت کے پھولوں میں آپ کا مقام ہو۔

''مجھے کہا جاتا ہے کہ میں آپ کے بارے میں کچھ کہوں ۔مگر میں کیا کہوں؟ ۔دنیا میں میری سب سے عزیز ترین ہستی آپ ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ تو اب اِس دنیا میں نہیں ۔مگر میرا دل نہیں مانتا بلکہ خیال میں یہی آتا ہے کہ آپ تو کسی جیل کی کال کوٹھری میں ایسے مجھ سے دور بیٹھے ہیں جیسے ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ میں نے آپ کا آخری دیدار صرف اس لیے نہیں کیا تا کہ میری یہ آس ٹوٹ نہ جائے۔ خلّی (نوشکی میں مینگلوں کا قدیم خاندانی قبرستان) میں ایک چھوٹا سا گنبد ہے اور کہتے ہیں کہ آپ اِس میں محوِ استراحت ہیں۔اور تین سال ہو رہے ہیں آپ کو مرے ہوئے۔کیا لوگ سچ کہتے ہیں؟۔ واقعی' آپ حقیقتاً مر گئے ہیں؟ ۔مجھے تو یقین نہیں آتا ہے۔آپ کیسے مر سکتے ہیں!!!۔آپ تو امر ہیں، زندہ جاوید ہیں۔ جب تک بلوچ قوم زندہ ہے، آپ زندہ رہیں گے۔اور جب تک دنیا باقی ہے، بلوچ قوم رہے گی ۔لہٰذا جب تک بلوچ قوم ہے، آپ باقی ہیں۔ شے مرید اور مست توکلی کی طرح آپ بھی عشقِ وطن میں دیوانہ تھے۔آپ کی سمی، آپ کی حانی یہی بے آب وگیاہ بلوچستان تھا۔آپ اپنے مسحور کن اشعار میں زندہ ہیں۔ میں آپ کی موت کو نہیں مانتی ۔آپ کی تعریف کروں تو لوگ کہیں گے بیٹی خود اپنے باپ کی تعریف کر رہی ہے۔اپنے منہ میاں مٹھو ہے''۔(4)

بلوچ قوم کی یہ عظیم بیٹی 28 فروری 2000ء کو اِس دار فانی سے کوچ کر گئی ۔ ملک جان اپنے نام، اپنے کام اور اپنی تخلیقات اور شہ پاروں کی وجہ سے امر رہے گی ۔محترمہ گوہر ملک کو اس کے گھر والے اور دیگر جاننے والے احترام اور پیار سے ''ملک جان'' کے نام سے یاد کرتے آئے ہیں۔

میر عبداللہ جان جمالدینی کے بقول ''گوہر ملک کے وفات پانے سے ہم گل خان نصیر کی زندگی اور علمی ادبی آثار پر کام کرنے والے اس اہم اور مستند سرچشمہ اور ذریعہ (source) سے محروم ہوئے''۔

ملک جان کو ایک بات کا آخر تک ملال رہا۔وہ یہ کہ وہ اپنے والد ملک الشعرا میر گل خان نصیر کی کلیات کو چھپوا نہ سکی۔ بلوچ اپنی بدقسمتی پر روئے گا ہی کہ ملک جان کی زندگی میں یہ کام نہ ہو سکا۔ حالاں کہ اس دور میں اُن خونی رشتہ داروں سے لے کر دور دراز کے میر گل خان کے روحانی بیٹے بہت بڑے عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔بس کسی کو کیا طعنہ دیا جائے ۔قومی بدقسمتی کا کیا جواز تلاش کیا جائے؟!

بعد میں بہت عرصہ بعد اُس کی چھوٹی بہن نے اپنے پیسے خرچ کر کے 1582 صفحات مشتمل کلیاتِ گل خان شائع کروائی۔اداروں اور ریاست کی تباہی کی اور کیا نشانیاں ہوں گی؟!

محترمہ گوہر ملک کو میر گل خان کی زیارت گاہ کے قریب دفن کیا گیا۔اور میر گل خان کی قبر پر سلامی دینے کا راستہ کچھ اس طرح ہے کہ گل خان سے پہلے گوہر ملک کی قبر آتی ہے۔آپ کو عظمت کے کمال تک پہنچنے کے لیے گوہر ملک کی پائنتی سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔

حوالہ جات

1۔بادینی، یار جان۔انٹرویو۔ماہنامہ سنگت مارچ 2000۔صفحہ 86

2۔بادینی، یار جان۔انٹرویو۔ماہنامہ سنگت مارچ 2000۔صفحہ 87

3۔کچکی یوسف۔کتاب۔بلوچ نے مجھے دھکا دیا۔صفحہ 121

4۔گوہر ملک شاہ محمد۔''اور بلوچ نے مجھے دھکا دیا''۔سنگت اکیڈمی آف سائنسز، کوئٹہ۔صفحہ 119

افضل توصیف

(18 مئی 1936......30 دسمبر 2014)

روشن فکر اور عقل و سائنس کی طرف دار افضل توصیف بنیادی طور پر مشرقی پنجاب سے پاکستان آئی تو بلوچستان آئی۔اس کا والد زیارت میں قائداعظم کی رہائش گاہ کی ڈیوٹی دیتا تھا۔بی اے تک اس نے کوئٹہ میں پڑھا۔ایم اے کے لیے لاہور گئی مگر پرائیویٹ اردو ایم اے کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج سے ایم اے انگلش کیا۔وہیں آخری عمر تک لاہور میں رہی۔

بلوچوں کے خلاف ہونے والے مظالم کے خلاف لکھتی تھی۔

وہ پیپلز پارٹی میں بھرتی ہوگئی۔

تمام عمر شادی نہیں کی۔نوید بھتیجا ہے۔

لیبیا گئی۔واپس آئی۔ضیا تھا آ گے۔

زندگی بھر آمریت سے جنگ کی۔

پنجابی زبان کی بڑی خدمت گزار تھی۔اردو، پنجابی، انگریزی میں لکھتی تھی۔افضل توصیف پنجابی اور اردو کی ایک بہت ہی نڈر اور تخلیقی ناول نگار، خوب صورت افسانہ نگار اور ادیب تھی۔وہ بہت سچی کالم نویس بھی تھی۔

32 کتابیں

29 دسمبر کو افضل توصیف کا انتقال ہوا۔ضعیف العمر افضل بہت عرصے سے بیمار تھی۔

اُسے بلوچستان سے عشق تھا۔وہ ہر وقت یہاں کی خیر مانگتی تھی۔

ہم اپنی دوست کی روح کے لیے بلند درجات کی دعا کرتے ہیں۔

******

[’سنگت‘ میں شائع شدہ ان کے ایک خط کا متن]

محترم جناب ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب

اسلام علیکم

جوڑ بخیر! راضی خوشی! سلامتی سکون

چند چیزیں ’سنگت‘ کے لیے۔تھوڑا راشن ہے۔جب تک چلے، چلا لیں۔’سپوتنک‘ مئی کے شمارے میری کتاب ہاری رپورٹ سے آخری فیصلے تک کا میٹر ہے۔یہ کتاب دوبارہ چھپے گی۔اب نام تھوڑا سا بدل دیا ہے۔کیوں کہ پہلے ہم نے بھٹو کی پھانسی کو آخری فیصلہ سمجھ لیا تھا۔مگر اتنے دنوں میں جو کچھ ہوا، اس سے تو یہی لگا کہ یہاں آخری بات قیامت ہی ہوگی۔

ہاری کے ساتھ انصاف نہ ہوا۔تب نہ آج۔لینڈ ریفارمز ہاری کے ساتھ ایک وعدہ تھا کانگریس کا، مگر پاکستان بنانے والوں نے جھوٹا وعدہ کیا۔اور حکمرانی کا حق وڈیرہ شاہی نے ہتھیا لیا۔یہ کھوٹے سکے ابھی تک چل رہے ہیں۔بنگال نے 1970ء میں بھاری اکثریت سے الیکشن جیت کر وڈیرہ شاہی سے نجات چاہی۔مگر وڈیرہ شاہی نے فوجیں چڑھا دیں۔خیر ان کی نجات ہوئی۔لیکن یہاں جب بھٹو نے ریفارم کرنا چاہی تو اسے پھانسی چڑھا دیا گیا۔بس یہی کہانی ہے۔اس پھانسی میں عدلیہ فریق تھی فوج اور ملا کی......آج جیوڈیشری اپنی بقا کے لیے لڑ رہی ہے۔بلوچستان میرا وطن ہے۔میری پالنے والی ماں ہے۔میرے ساتھ دونوں صورتوں میں یہی قصہ ہے۔جنم دینے والی ماں، اور پالنے والی ماں۔الگ الگ تھیں۔میں نے اپنی بایوگرافی میں لکھا بھی ہے۔

چند روز پہلے دو پیارے دوست آئے تھے۔بوجھو!!

شبینہ رفعت، نیرّ اقبال علوی کہ جرمنی سے آئے ہوئے تھے۔افسوس کے لیے آئے۔

کوئٹہ آنا چاہتی ہوں ۔ یادوں کے لیے ،ٹھنڈی شاموں کے لیے اور انگوروں کے لیے بھی ۔مگر تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے ۔اور زندگی کے لیے ۔

’زمیں پہ لوٹ آنے کا دن‘ بھیج رہی ہوں ۔ایک کاپی استاد محترم (جمالدینی) کے لیے ۔ پہنچا دینا اور سلام بھی ۔

’سنگت‘ کا نیا شمارہ ۔رات ایک بجے پڑھنا شروع کیا اور سویرے تڑکے یہ جملہ لکھ کر سو گئی ۔

’’یہ لوگ پرچہ نکال کر سو جاتے ہیں ،اور ہمیں پڑھنے پر لگا دیتے ہیں ۔‘‘

سچ مچ کمال کر دیا ۔اداریہ کاٹ دار ہے ۔

لینن بھی ہے ۔ترہ کئی بھی ہے ۔حمیدہ گھانگرو ،ارے واہ!

اور یہ کارل مارکس ،ارے بابا اردو میں لکھو نا ۔نہیں تو بلوچی پڑھاؤ ۔

افضل توصیف ،لاہور

ڈھال سینہ

محمدعلی صدیقی

(7 مارچ 1938..........9 جنوری 2013)

ذرا سوچیے ، کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ تیسری دنیا کا ایک ملک ہو ،اور اس میں سچی گواہی دینے والا کوئی تنقید نگار ہو ،مگر وہ ادیبوں شاعروں کو ناراض نہ کرتا ہو؟ ایک ناممکن بات ہے ناں! ۔مگر اس حوالے سے میں نے کسی شاعر وادیب کو محمد علی صدیقی سے شخصی ناراضی میں نہ دیکھا ۔اس بسیار نویس وبسیار گو وبسیار نوش کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تخلیق کار کی عزتِ نفس کا خصوصی خیال رکھتا تھا ۔بہت ہی غیر متعصب انداز میں اپنا اتفاق اختلاف لکھتا تھا ۔محمد علی کو جس طرح اپنے نام کا بڑا خیال رہتا تھا ، اسی طرح وہ دوسروں کی شخصی ہتک اور دل آزاری بھی نہیں کرتا تھا ۔

صدیقی صاحب کراچی کے اُن لوگوں میں سے تھا جن کے ساتھ ہماری دوستی ڈاکٹر امیر الدین نے کرائی تھی ۔ ایسی دوستی جو فکری ہم آہنگی ، دانش ورانہ ہم سفری اور مشترک اہداف کے مضبوط ستونوں پہ قائم تھی ۔تنظیمی طور پر چھوٹے شہروں پر ’لکڑی چھبوئی‘ تو خیر بڑے شہروں کا ایک مشغلہ ومظہر ہوتی ہے ،اس کا ذکر کیا کرنا ۔..........اور بالخصوص جب صدیقی جوابِ شکوہ کے لیے زندہ نہیں ہے ۔

مایہ ناز ماہر تعلیم اور اردو ادب کا یہ سکالر ونقاد 74 برس کی عمر میں انتقال کر گیا ۔بلڈ پریشر

سے اس کے دماغ اور گردوں کو نقصان پہنچا۔

محمد علی صدیقی پاکستان میں سرمایہ داری نظام کے انحطاط پذیر نظریات کی درآمد کے خلاف عقل و دلیل کا شاشان پہاڑ تھا۔ وہ جدیدیت، مابعد جدیدیت اور وجودیت نامی ادبی نظریات کا سب سے بڑا مخالف تھا جو سرمایہ دارانہ نظام کے نظریات ہیں۔ اِن سارے نظریات کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ ادب سے سماجی جوہر کو خارج کر دیا جائے ،ادب کو زندگی سے دور پھینکا جائے اور محض لطف لینے کے لیے ادب میں تاک جھانک کیا جائے۔محمد علی صدیقی روشن فکر اور انسان دوست اور سماجی ادب کا سب سے بڑا پرچارک تھا۔(یہ دلچسپ ہے کہ قحط الرجال یا پھر، غیر سنجیدگی نے اُسی شخص کو بلوچستان میں مجبور کر دیا کہ اُس نے وجودیت کے سب سے بڑے ترجمان کو اپنی تنظیم' پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی صوبائی شاخ کا سربراہ مقرر کر دیا)۔

چھ بہن بھائیوں کا یہ بھائی مارچ 1938ء میں ہندوستان کے مقام امروہہ میں پیدا ہوا تھا اور دس برس کی عمر میں 1948ء میں پاکستان آیا۔اس نے ابتدائی تعلیم کرسچین مشن سکول میں حاصل کی۔ڈی جے سائنس کالج سے انٹر کیا اور 1962ء میں کراچی یونیورسٹی سے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔اس نے کراچی یونیورسٹی سے پاکستان سٹڈیز میں لٹریچر میں پی ایچ ڈی کر لی۔2003ء میں اس نے ڈی لٹ کیا۔

میں نے اس کی شاعری کے بارے میں کبھی نہ سنا تھا۔نہ خود اُس نے کوئی تذکرہ کیا تھا۔ نہ ہی کسی مشاعرے میں اپنا کلام سنانے کی شاعرانہ خواہش اسے پھڑکی تھی۔مگر اب معلوم ہوا کہ وہ ''گوہر'' تخلص کے ساتھ شاعری کرتا تھا۔اردو میں بھی،اور انگریزی میں بھی۔

صدیقی صاحب بہت مطالعہ کرتا تھا۔وہ لسانیات کا ماہر تھا۔بلاشبہ وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا نقاد تھا۔جس کسی سے بھی صدیقی کا دانش ورانہ اختلاف ہوتا وہ بھی اس کی بصیرت اور علمیت کا اعتراف کرتا۔واقعتاً شرق و غرب کا علم رکھنے والا سکالر۔یہ ترقی پسند تنقید نگار اگر یہاں کی ادبی صورت حال سے واقف تھا تو ساتھ ساتھ عالمی ادب کے حال سے بھی

خود کو بہت معلوم دار رکھتا تھا۔قادر الکلام دانش ور۔اس لیے وہ بولتا تھا........اتنا بولتا تھا اتنا بولتا تھا کہ بس!۔مگر چوں کہ موضوع میں یکسانیت نہ ہوتی تھی ،فکر میں کنفیوژن نہ تھی اس لیے مخاطب زیادہ بور نہ ہوتا تھا۔

وہ بہت متحرک شخص تھا۔اَن تھک کام اور محنت کا نشئی۔شدید جدوجہد،لگن اور استغراق سے کام کرنے والا۔ ایک ایک دن میں کئی سیمیناروں میں تقریریں کرتا ملتا، ادبی نشستیں، چھوٹی محفلیں، نیز کسی ایک شخص کے ساتھ گھنٹوں بولتا ہوا۔اس شخص کو پڑھنے، بولنے اور لکھنے کے لیے ہی پیدا کیا گیا تھا۔

محمد علی صدیقی بہت زیادہ سانولے رنگ کا لحیم شحیم شخص تھا۔ ایسا چوڑا سینہ جیسے انگریزی فلموں میں ٹارزن وغیرہ کا ہوتا ہے۔ بڑا سا چہرہ۔ چشمہ کے پیچھے دو چمکتی زیرک آنکھیں ۔ایدھی امین ٹائپ کی چیز ،موغابے جیسا شخص۔محمد علی صدیقی ہنستا بھی گہرائی اور وسعت کے ساتھ تھا۔

ہمارا یہ عالم فاضل دوست ہم عصر عالمی ادب اور ادب کی جاری و ساری تحریکوں کے بارے میں خوب باخبر رہتا۔وہ سوشلسٹ ادب کا آدمی تھا۔عقل،عقلیت اور شعور کا طرف دار دانش ور۔بشر دوست اور روشن فکر دانش ور تھا۔جب بھی ہمارے نظریے کو دانش ور کی طرف سے چیلنج آجاتا تو وہ اپنا وسیع سینہ ڈھال بنا دیتا۔وہ اپنی ساری علمیت سے مسلح ہو کر جرأت کے مورچے پر بیٹھ جاتا اور دلیل کی ہر منجنیق، ہر گولہ، ہر پتھر استعمال کرتا۔...........اگر بہادری کے اپنے رسوم ورواج کے ساتھ۔ اگر بے خوفی تھی تو ساتھ میں شرافت ومتانت کی حدوں کا خیال بھی رکھتا تھا۔ جنگ میں بھی تو جائز ناجائز میں فرق رکھا جاتا ہے۔ وہ تقلید پسندوں کی مخالفت میں لیفٹ ملائیت تک نہ جاتا تھا۔

نثر میں محمد حسن عسکری جدیدیت کے علم بردار کے بطور ترقی پسندی کا سخت مخالف تھا، گویا وہ اس نظریے کے دشمن سپاہ کا سائیسر وتھا۔ گو کہ ترقی پسندی کے مخالفین میں ہندوستان میں گوپی چند نارنگ اور پاکستان میں حفیظ جالندھری، انتظار حسین جیسے نام ور لوگ بھی شامل تھے۔مگر عسکری ایسی

ایسی دلیلیں اٹھالاتا کہ مخالف صفوں میں لاجوابی صاف دکھائی دیتی۔ جہاں بس چلتا ترقی پسندی کا کچومر نکال کر ''جدیدیت'' کو تخت نشین کروادیتا۔ مگر جہاں اسے اس کا موقع نہ ملتا وہاں جدیدیت اور ترقی پسندی کو ہم معنے قرار دے کر ایک دیرپا کنفیوژن بو دیتا۔ اُس ڈکراتے ہوئے پیلا کے خلاف سب کو پتہ تھا کہ،

زہماں دلیلہ کاریں

اول آزمائینتغیں مزاریں

عسکری لاؤلشکر کے ساتھ اور صدیقی تقریباً یک وتنہا۔ اُس نے جدیدیت کو ماضی کا پناہ گزیں ثابت کیا، اسے ساعتِ موجود سے مفرور بھگوڑا قرار دیا۔ چیزوں کو مزید صاف کرنے اس نے ان کے لیے نیا لفظ بنایا: ''جدیدیئے''۔ اِن زندگی مخالفوں، دُھند وکہر کے سوداگروں، یاسیت پسندوں، سیاست گریزوں، خالص و خودمختار ادب کے مبلغوں، متن متن جپنے والوں، سائنس بیزاروں کے خوب لتے لیے۔ اس کی نظر میں حقیقت پسند، معروضیت پسند اور سائنس دوستی ادب میں اسی طرح خیر مقدمی ہیں جس طرح کہ خانقاہیت ورہبانیت ناپسندیدہ ہیں۔ جمہور اور جمہوریت نوازی ادیب ودانش ور کا زیور ہوتے ہیں، عوام الناس کی بصیرت پہ شک وشبہ شیطانیت ہوتی ہے۔ ادب تو زندگی آمیز اور زندگی افروز وسیلہ ہوتا ہے۔

ترقی پسندی کے خلاف شاعری کے میدان میں افتخار جالب سربراہی کررہا تھا۔ اور اس کے خلاف بھی یہی آزمایا ہوا صدیقی ڈٹ گیا۔

اسی طرح پچھلی ربع صدی کے آخری ربع میں ترقی پسند خیالات کو سب سے بڑا چیلنج سوویت یونین کا مرحوم ہوجانا تھا۔ محمد علی صرف دو دلیلیں ہی دیتا تھا۔ ایک، فیوڈل ازم کے ساتھ اکیسویں صدی میں کوئی گزارہ ممکن نہیں۔ دوسرا یہ کہ جب تک سماج میں سماجی و معاشی ناانصافی موجود رہے گی، پراگریسو نظریات زندہ اور متحرک رہیں گے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی امید کا پیامبر دانش ور تھا۔ خواب دیکھنے اور دکھانے والا عالم تھا۔ وہ یاسیت وناامیدی پھیلانے والوں کے خلاف اس خطے کا سب سے مؤثر انٹی ڈوٹ تھا۔ وہ بے عملی کو

گناہ تصور کرتا تھا۔ زندگی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

سارے اردو بولنے والے ترقی پسندوں کی طرح صدیقی بھی سرسید کو بہت بڑی بلا سمجھتا تھا۔ اور اسے وہاں ہندوستان کے دل سے گھسیٹ کر یہاں مسلط کرتا تھا۔ یہاں، جہاں روشن فکری کی ایسی درخشاں تاریخ ہے، سرسید جس کے پیر دھو کر پی لے۔ اسی طرح وہ جناح صاحب اور اُن کی گیارہ اگست والی تقریر کو ہر مرض کا تیر بہ ہدف تعویذ گردانتا تھا۔ ہضم نہ ہونے کی حد تک وہ اس میں روشن فکری اور جمہور دوستی تلاش کرتا۔ اس نے جناح صاحب پر ایک نہیں، دو نہیں چار کتابیں لکھ ماریں۔ اور اُن سے منسوب ادارے میں افسری کے دوران واقعتاً وہ جناح پرست بن گیا تھا۔ اس کے بحثوں کا عنوان ہی وہی ہوا کرتا تھا۔ یہ شریف آدمی اقبال میں بھی آنکھ بند کر کے ترقی پسندی دیکھتا تھا۔ جہاں موقع ملتا فوراً اقبال کا کوئی نہ کوئی مثبت پہلو تلاش کرتا۔ قراۃ العین طاہرہ کو خراج تحسین پیش کرنے والا اچھا اقبال وہ سامنے لاتا ہے مگر وہ اس کا رجعتی اور ترقی دشمن پہلو چھپا دیتا ہے۔ وہ اقبال جس کا شکوہ سنو تو ملا عمر کا قومی ترانہ لگے، اور جوابِ شکوہ دیکھو تو اسامہ کا منشور۔ وہی اقبال جس کا ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' ترقی پسندی کے کسی بھی برانڈ کو تو چھوڑیے پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ تک کی جمہوریت کی ہر راہ مسدود کر چھوڑتا ہے۔ یہ اچھا آدمی اقبال کو ''اشتراکی مسلم'' قرار دینے والوں کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ (لگتا ہے ہم ترقی پسندوں میں موجود اقبال دوستوں اور اقبال مخالفوں، دونوں نے بہت مبالغہ کیا ہے)۔

ممکن ہے سرسید، اقبال کی فکر اپنے زمان ومکاں میں ترقی پسندی کے قطرے رکھتی ہو مگر ہمارے (تقریباً سارے) اردو بولنے والے دوست سرسید واقبال وسی پی یوپی اور ہندو مسلم معاملہ سے آگے بڑھتے ہی نہیں........... اور شاید یہی اصطلاحات، یہی الفاظ وموضوعات ہمیں لے ڈوبنے کے بڑے ذمے دار ہیں۔

محمد علی صدیقی کلاسیکی ادب کا بہت بڑا معترف تھا۔ وہ تعلیم کے لیے کلاسیک ادبی خزانے کو اہم ترین اوزار سمجھتا تھا۔ وہ ادب کو سماجی معاشی معاملات سمجھنے کا بہت بڑا ذریعہ گردانتا تھا۔

محمد علی ترقی پسند نظریہ کے مستقبل سے بہت پرامید تھا۔ وہ اس کنفیوژن میں نہ تھا کہ

سامراج کی مخالفت کسی بھی بہانے ترک کی جائے۔ ملاّ خواہ امریکہ کی دشمنی کریں نہ کریں مگر ترقی پسند دوستوں کو ہمہ وقت اور تادیر سامراج دشمنی کی پالیسی رکھنا ہوگی۔ رجعت اور سامراج کے باہمی تعلقات خواہ کچھ ہوں جمہوری لوگوں کے لیے دونوں دشمن ہیں۔ رجعت، سامراج کے بغیر ہل نہیں سکتی اور سامراج ملاّ کی مدد کے بغیر چل نہیں سکتا۔

ہمارا یہ عالم دوست دنیا کی مختلف یونیورسٹیاں گھوما، لیکچر دینے۔ اس نے 14 کتابیں لکھیں اور سو سے زائد تحقیقی مقالے لکھے۔ وہ انسائیکلوپیڈیائی دماغ تھا۔ ایک ادارہ تھا۔ وہ مارکسسٹ دانش ور تھا۔ جدلیاتی انداز میں سوچتا تھا۔ اس کی کمٹ بہت پختہ تھی۔ اس نے کئی کتابیں لکھیں جن میں کئی تنقیدی تجزیے پر ہیں۔

''نشانات'' میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، اقبال، پابلو نرودا، حسن عسکری، سارتر، پریم چند، کرشن چندر وغیرہ کی تخلیقات کا تجزیاتی مطالعہ بھی نظر آتا ہے اور ساتھ ہی فیض، فارغ بخاری، کشور ناہید، حسن عابد، شبنم رومانی، ابن انشا کی شاعری اور احمد داؤد کے افسانوں پر بھی اظہارِ خیال دستیاب ہے۔ ان سب شاعروں اور ادیبوں کی عوام دوستی کو موضوع اظہار بنا کر محمد علی صدیقی نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا ہے۔ محمد علی صدیقی نے جن شعرا اور ادبا کو اپنے مطالعے کے لیے منتخب کیا ہے، ان سے بھی ان کی آؤٹ لک کی ورائٹی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ایک نظریہ ساز نقاد اور شارح کے فرق کا سراغ مل سکتا ہے۔

'نشانات' میں پچیس مضامین شامل ہیں، چھ ادبی مسائل کے حوالے سے، پانچ لسانی مباحث کے ضمن میں' سات مشہور مرحوم ادیبوں اور دانش وروں کے سلسلے میں اور سترہ اجمالی مطالعے کے عنوان سے رقم ہوئے ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ محمد علی صدیقی ایسے مسائل پر اظہارِ خیال کرنے کے گرویدہ ہیں جن کا تعلق عہد جدید کی فکر اور تعلقات سے ہے۔ ادبی مسائل کے عنوان سے جو مضامین اس مجموعے کی زینت بنے ہیں اس میں ''ادب اور جمہوری اقدار'' اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہوں نے اس میں نئے ادب اور نئی تنقید کا اولین مقصد حقیقی جمہوری معاشرے کے قیام میں اعانت قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں

نے یورپی ادب کے غیر جمہوری طرزِ احساس اور ترقی پسندوں کے تخیلاتی خوابوں کو بھی رد کیا ہے۔ انہوں نے منطقی اثباتیوں کے جمہوریت دشمن رویے پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ''روایت اور جدیدیت'' میں محمد علی صدیقی حسن عسکری کی کتاب ''جدیدیت مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا ایک خاکہ'' میں عسکری صاحب کے سائنس دشمن رویے کا بھی پول کھولتے ہیں۔ شواں اور رینے گینوں کی فارمولیشنز سے بھی اپنے اختلاف کا تذکرہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں، ''روایت کا یہ تصور انسانی تہذیب کی مادی ترقی سے کس درجہ بےزار ہے۔ اس تصور روایت نے انسانی تہذیب کو غیر متغیر مان کر ارتقائی قوانین سے بلکہ وقت سے آنکھیں موند لی ہیں۔''

تنقیدی مضامین پر مشتمل پہلا مجموعہ ''اشارئیے'' ہے۔

دوسرا ''توازن'' (1976) ہے جو شاید سب سے اچھی (یا کم از کم میرے گز سے) کتاب ہے۔ موضوعات ہی دیکھیے: یاسیت کی مابعد الطبیعات، نئی اردو شاعری کی فلسفیانہ اساس، یاسیت پسندی اور نطشے، ترقی پسندی اور جدیدیت، کیا ادب غیر ذاتی ہوتا ہے؟، جمالیاتی اضافیت، ادیب اور ہمارا نوجوان قاری، ادب اور سیاست، ادب اور ثقافت، ہمارا ادب اور قومی دماغ .... مزے دار، مزے دار فقرے ہیں، پر مغز الفاظ ہیں اور بلا کی روانی ہے۔ پونے تین سو صفحے کی ضخیم کتاب ہے، ٹائپ اچھا نہیں ہے مگر مجال ہے کہ آپ کسی جگہ بور ہوں۔ صدیقی کا مطالعہ بڑا غضب کا تھا، اس کی یادداشت نے ہر ہر پیراگراف میں اس کا ساتھ دیا۔ اور اس کے تجزیاتی ذہن نے گنجلک و دشوار موضوعات کی ژولیدگی میں زبردست کنگھی کر دی۔

تیسرا ''نشانات''،

چوتھا ''مضامین''،

پانچواں، جہات ہے۔

''ادراک'' (2007) اُس کے تنقیدی مضامین کا چھٹا مجموعہ ہے۔ 240 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے پیش لفظ ہی میں صدیقی اعلان کرتا ہے کہ ''میرا ادبی نظریہ جدلیاتی ہے''۔ اگلے ہی مضمون میں وہ بتاتا ہے کہ ''متعدد حضرات نے اپنے نظریات کو خیرباد کہہ دیا ہے اور پوسٹ ماڈرنزم

کی لہر نے بنیادی مسائل کو حاشیوں کے سپرد کر دیا ہے‘‘۔اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ’’نظریاتی مباحث‘‘ کا ہے جہاں اس نے جن موضوعات پر بحث کی اُس کے موضوعات یہ ہیں:

نیا عالمی نظام، مابعد جدیدیت اور ادب، ادب و احتساب، زبان و تہذیب، پاکستانی کلچر کا مسئلہ۔

دوسرا حصہ ’’شعر اور فکشن‘‘ کے نام سے ہے جہاں اس نے میر، غالب، یگانہ چنگیزی، شاہ لطیف، مجاز، ابراہیم جلیس، صبا اکبر آبادی، حمیرا رحمٰن، حسن عابدی، پیرزادہ قاسم، ٹی ایس ایلیٹ، قمر رئیس، ساجدہ رشید، شیخ ایاز، عبداللہ حسین، محبوب خزاں، صابر ظفر، امداد نظامی اور شاہد نقوی کے فکر و فن پر بہت خوب صورت جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب بلاشک وشبہ ’’توازن‘‘ جیسی علم افزا کتاب ہے۔ اسے پڑھ کر بہت مزہ آیا۔

’’کروچے کی سرگزشت‘‘ (ترجمہ)۔ یہ کروچے صاحب ہمارے زمانے میں انجانا سا شخص ہے اور سچی بات ہے کہ صدیقی صاحب کی کتاب سے اُس کے بارے میں مکمل ادراک ہوا۔ یہ اطالوی نقاد و مفکر مارکسسٹ بھی تھا اور اس کا منکر بھی۔

2002ء میں اس کی ’’سرسید احمد خان اور جدت پسندی‘‘ چھپی۔ پتہ نہیں اس کتاب کی صدیقی صاحب کو کیا ضرورت پڑی۔ پاکستان میں یہ شخص اجنبی بھی ہے اور irrelevant بھی۔ کون سی اکیڈمک اشتیاق نے سوا دو سو صفحات کی ایک بڑی کتاب اس سے لکھوا دی۔ احمد خان (یا سید احمد) سر کا خطاب سر پہ سجائے کیوں کر ہم پر مسلط ہوگا جس کا ایک خلیہ بھی (جسمانی اور فکری دونوں) یہاں کا نہیں ہے، اور نہ ہی عالم گیر۔ صدیقی صاحب ہمارے دوسری ہندوستان نژاد پاکستانیوں کی طرح ناسٹلجیا میں مبتلا، ہندو مسلم، یو پی سی پی میں ساری زندگی الجھا رہا۔ سرسید کا دفاع کرتے کرتے وہ اقبال کو بھی تبدیلی، حرکت کا باعث قرار دیتا ہے۔ اس کے بقول دونوں نے ایسے موضوعات پر بحثیں کیں جو اس زمانے میں ممنوعات میں آتے تھے۔

اور اب حال ہی میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ چھپا ہے: ’’نکات‘‘۔

’’جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ‘‘ نامی کتاب 2006ء میں چھپی۔ یہ جوش ملیح آبادی کے فکر و فن پر مشتمل خوب صورت کتاب ہے۔ تقریباً ڈھائی سو صفحات کی یہ کتاب اس لیے لاثانی ہے کہ صدیقی صاحب نے جوش کے عہد کی سیاسی سماجی معاشی پس منظر میں جوش کی شاعری کے ارتقا پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب جوش کے موضوع پر ہوتے ہوئے جوش کے پورے زمانے کی سماجی ساخت پر بحث کرتی ہے۔ اسی پس منظر میں جوش کی فنی و ادبی مقام کا جائزہ لیتی ہے۔

ایک مجموعہ ہے: ’’غالب اور آج کا شعور‘‘۔

کہتے ہیں کہ وہ ایک کتاب نامکمل چھوڑ گئے: ’’پوسٹ ماڈرن ازم اور لٹریچر‘‘

’’فیض احمد فیض: درد اور درماں کا شاعر‘‘ فیض اس کے پسندیدہ نقادوں میں سے تھا (فیض، درد اور درماں کا شاعر۔ روزنامہ جنگ، 13 فروری 1983) معتبر کتابیں، معتبر مصنف۔ ڈاکٹر صاحب لکھاریوں، شاعروں اور صحافیوں کی ایک پوری نسل کا نظریہ دان اور استاد رہا۔ سماجی انصاف کے ساتھ اس کی کمٹ منٹ اور دلیل و ترقی پسند اپروچ بے مثال تھی۔ وہ prolific مصنف تھا۔

وہ روزنامہ ڈان میں ’’ایریل‘‘ کے قلمی نام سے بیس برس تک ’’لٹریری راؤنڈ اپ‘‘ نامی ایک مقبول و معتبر کالم لکھتا رہا۔ تقریباً ہر موضوع پر۔ مگر زندگی سے متعلق ہر موضوع پر۔ عام انسان کی زندگی کے مسائل، مصائب، دکھوں اور تکالیف پر۔ صدیقی سنگت کے ایڈیٹوریل بورڈ کا ممبر تھا، ارتقا کے ایڈیٹوریل بورڈ میں تھا۔ ایک یونیورسٹی میں humanites اینڈ سوشل سائنسز کا ڈین تھا۔

صدیقی صاحب ارتقا میں ’’ہمارا مؤقف‘‘ کے عنوان سے اداریہ لکھتا تھا۔ جس میں اہم ملکی و بین الاقوامی امور کے علاوہ ادبی معاملات پر کھل کر بات کرتا تھا۔ مثلاً ’’ارتقا‘‘ کے 53ویں شمارے کے اداریے میں اس نے ادب اور ادبی تنظیم کے بارے میں یوں لکھا:

’’انجمن ترقی پسند مصنفین کے نومنتخب امیدواروں سے یہ توقع کی جانی چاہیے کہ وہ ادب کے ذریعے سماجی تبدیلی اور ترقی کے لیے کام کرنے کی اہم ذمہ داری پوری کرتے رہیں گے۔

’’ایک ایسے دور میں جب ترقی یافتہ ممالک کا کلب غریب ممالک کے معاشی استحصال

کے لیے نت نئے حربے اختیار کر رہا ہے اور اپنے مذموم مقاصد کے لیے ایک ایسے نظریہ علم کو عام کرنا چا رہا ہے جس سے طبقاتی کشمکش ، روشن خیالی اور انسانی دوستی کے مثالیے قابلِ تضحیک قرار دینے کی ہمہ جہت کوششیں ہو رہی ہیں ۔ ہمارا خیال ہے کہ ترقی پسند مصنفین کے کاندھوں پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعے ایسی تمام کوششوں کا جائزہ لیں جو روشن خیالی اور انسان دوستی کے خلاف ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ عوامی مسائل کی سنگینی کا ادراک کریں اور اسی ادراک کے راستے میں حائل فکری مغالطّوں کی یورش پر کڑی نظر رکھیں چوں کہ اس کے بغیر نہ ہم عصری مسائل کی تفہیم ہو سکے گی اور نہ ان سے نمٹنے کے لیے مؤثر کوششیں ممکن ہوں گی''۔

محمد علی صدیقی کانفرنسوں ،سمیناروں کی جان ہوا کرتا تھا۔انتہائی سنجیدگی سے دوسروں کی بات سنتا (کچھ لوگوں کو جائز اعتراض میرے پورے مضمون میں لفظ 'سنتا' پہ ہوگا، پیشگی معذرت)اور پھر زبردست دلیلوں ،مثالوں اور حوالوں کے ساتھ اپنی بات رکھتا۔محمد علی صدیقی نے نظری و اطلاقی تنقیدی منطقوں کو کم وبیش یکساں اہمیت دی ہے۔اس کے تنقیدی مطالعات میں معروضیت و استدلال ،حقیقت پسندی، کشادہ نظری، روشن فکری اور عقلیت پسندی موجود تھی۔ وہ صرف ترقی پسند تنقید نگار نہ تھا۔ بلکہ وہ تو ڈٹ جانے والا مؤقف کار تھا۔وہ جدیدیت و مابعد کا سخت مخالف تھا۔اور جدیدیت والوں کے ماتھے اس کے نام کے سنتے ہی اس قدر شکن آلود ہو جاتے، جیسے بچہ ایک کڑوی دوا پیتے وقت ہوتا ہے۔وہ میٹافزکس لکھنے والوں کو عصری تقاضوں کا مخالف سمجھتا تھا۔

اردو زبان بولنے والے صدیقی کو بلوچی زبان سے بہت رغبت تھی ۔ اس نے بلوچ کلاسیکل شعرا کے کلام سے اچھی خاصی تفہیم بنالی تھی ۔صدیقی صاحب جام،مست اور نصیر دعطا کو quote کرتا تھا۔سنگت میں اس کا ایک مضمون ''بلوچی لوک داستانیں اور معاشی ترقی'' کے نام سے چھپا۔ اُسے بلوچ ادبی تاریخ، اس کے نظام اقدار اور اس کے ادبی سرمائے کے بارے میں بہت جان کاری تھی ۔اُسے ہماری ہماری زبان کے مستقبل کے لیے عالمانہ تشویش تھی۔

......بلوچ قوم اور بلوچی زبان کا ایک خیر خواہ اُٹھ گیا۔

******

('سنگت' میں دوہزار پانچ کو لکھے گئے ان کے ایک خط کا متن)

برادرم ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب

سلامت باشد

امید ہے تم مکمل خیریت سے ہو۔ان دنوں خیریت کے ساتھ مکمل کہنا ضروری ہے۔
''نیا زمانہ'' کا مئی 2005ء کا تازہ شمارہ ملا،اس میں گوادر کے عنوان سے تمہارا مضمون پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ بہت بڑا جغرافیائی خطہ ہو اور آبادی کم ہو تو وہاں فیملی پلاننگ کی اسکیمیں نہیں ہونی چاہئیں بلکہ افزائش نسل کی سکیمیں ہونی چاہئیں ۔تم نے بلوچستان کی سماجی زندگی کے بارے میں بہت معروضی حقیقت نگاری کی ہے۔ جب تک کہ بلوچستان میں بلوچوں کے سر کی قیمت دوسری نسل اور لسانی اقلیتوں کے لوگوں کے مقابلہ میں قصاص یا قبائلی نظام کے رسم ورواج کے مطابق سب سے زیادہ رہے گی اور غریب بلوچ رسم ورواج کا شکار ہوتے رہیں گے،مسئلہ گھمبیر رہے گا۔اس مسئلہ پر بھی قلم اٹھاؤ۔اور یہ بتاؤ کہ بلوچ بے رونی دشمنوں سے تو بہت آگاہ ہیں،اندرونی دشمن کون ہیں۔ اندرونی دشمن، بے رونی دشمن سے زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔

بہت دنوں سے کراچی آئے ،نہ خط آیا اور نہ رسالہ۔آخر یہ ناراضی کیوں ۔ہم تمہارے چاہنے والوں میں سے ہیں ۔ اطلاعاً عرض ہے کہ مجھے کراچی یونیورسٹی نے ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی ڈگری تفویض کی ہے۔کراچی آؤ تو مٹھائی کھلائیں۔

دوستوں کو سلام

تمہارا مخلص

محمد علی صدیقی